U092

CHECKED

من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عند ربه

حیاتِ محسن

یعنے

سوانح عمری نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ بہادر

مرتبہ

مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی

سابق مہتمم تاریخ ریاست بھوپال

حسب الارشاد

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۴ء طبع ہوئی

خزینہ معلومات مفت طلب کیجئے

چند سال سے کانفرنس نے اپنا بک ڈپو قائم کیا ہے جس میں اُردو کے تمام مصنفین مثلاً سرسید نواب محسن الملک، مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حافظ نذیر احمد، مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) وغیرہ کی تصنیفات موجود ہیں جو مناسب نرخ پر فروخت ہوتی ہیں۔

بچوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت نیز فن تعلیم کے متعلق بھی متعدد معتبر و مفید کتابیں اس بک ڈپو سے مل سکتی ہیں، اس کے علاوہ گزشتہ چند سال میں خود کانفرنس نے جو عمدہ و دلچسپ کتابیں نہایت اہتمام سے حسن طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی ہیں مثلاً وقار حیات، یادِ ایام خطبات عالیہ، فطرتِ اطفال، التربیۃ الاستقلالیہ، سلاطینِ معبر، تاریخ ملیبار، رسالہ اتالیق بچوں کی تعلیمی ریڈریں وغیرہ خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں، ایک خاص بات یہ ہے کہ عام فائدہ کے خیال سے باوجود ظاہری و معنوی محاسن کے ان کی قیمتیں بہت کم رکھی گئی ہیں۔ یہ کتابیں بھی کانفرنس بک ڈپو سے ملتی ہیں اور زیادہ خریداری پر تاجروں کو کمیشن بھی دیا جاتا ہے۔

ان سب کتابوں کے تفصیلی حالات اور اُن کی قیمتیں رسالہ خزینہ معلومات سے معلوم ہوں گی آپ صرف ایک کارڈ لکھ دیجئے۔ رسالہ خزینۂ معلومات جو ۵۰ صفحے کا ہے دفتر سے محصول ڈاک لگا کر آپ کی خدمت میں بلاقیمت بھیج دیا جائے گا۔ اس کو پڑھ کر آپ اپنے مذاق و شوق کی کتابیں طلب کر لیجئے۔

ملنے کا پتہ

صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

فہرست مضامین



نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید
مہدي علی خان منیر نواز جنگ
(آخر زمانہ حیات میں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محسنُ الملک

ابتدائی حالات، انگریزی اور حیدرآباد کی ملازمت

وظیفۂ خدمات

تمہید — قدیم یونانی اور اُن کی دیکھا دیکھی رومی اپنی حکومت کے استقلال کے لئے ممالک مفتوحہ میں بھی جا بجا نوآبادیاں قائم کیا کرتے تھے جہاں اُن کے ہم قوم سپاہی آباد ہو کر یونانی و رومی تہذیب، عصبیت اور جاہ و جلال قائم رکھا کرتے تھے اور جب وقت آپڑتا تھا تو اُن ہی میں سے کوئی مجدد، کوئی سپہ سالار، کوئی قومی سردار اور کوئی شہنشاہ نکل آتا تھا۔ جب ممالک اسلامیہ کے حدود وسیع ہوئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی یہی پالیسی اختیار کر کے کوفہ و بصرہ کو آباد کیا جو رفتہ رفتہ اسلامی عظمت و جبروت کے نشانات بن گئے اور یہی

پالیسی رفتارِ زمانہ کے ساتھ دوسرے اولو العزم شاہانِ اسلام نے بھی اختیار کی۔ ہندوستان جب اسلامی پھریرہ کے سایہ میں آیا تو اسلامی حکومت کے استحکام اور تمدن کی ترویج کے لئے نامور سرداروں اور جاں باز سپاہیوں کو جاگیرات عطا ہوئیں اور وہ مع اپنے قبائل کے وہیں آباد ہو گئے اور اس طور سے اُن قصبات کی بنیاد پڑی جو خاص کر تمام شمالی ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور جو آج بھی اسلامی شرافت اور اخوت کا مامن سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ اُن قصبات کے رہنے والے اُن اثرات سے دور ہونے کی وجہ سے جو شہروں میں وسعتِ خیال، تکلفاتِ معاشرت اور تمدنی اختلافات کا موجب ہوتے ہیں کسی قدر تنگ خیالی کا مرکز بن گئے۔ لیکن یہی تنگ خیالی اُن کے نسب کی حفاظت، ان کی عصبیت کے استحکام، ان کی جرأت وہمت کے قیام اور اُن کی سادہ زندگی کے تحفظ کا باعث ہوئی جو انسان کو معراج کمال پر پہنچانے کے لئے لازمی ہے اور وہ بھی یونانی و رومی نوآبادیوں کی طرح اسلامی شرافت، اسلامی اخوت اسلامی غیرت، اسلامی قوت، اسلامی سادگی اور روشن دماغی کا مامن بن گئے اور ان ہی کی خاک سے ضروریات زمانہ کے مطابق ایسے ایسے علمار ایسے ایسے سپہ سالار، ایسے ایسے وزرا اور مدبر اُٹھے کہ آج تک اُن کے کارنامے صفحۂ روزگار پر زریں حروف میں ثبت ہیں۔

خاندان

ان ہی قصبات میں سے ایک قصبہ اٹاوہ بھی ہے اور وہاں کچھ زمانہ سے ایک خاندان آباد ہے جو مشہور سادات بارہہ کی شاخ سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ ساداتِ بارہہ کی جہالت ضرب المثل کی حد تک پہونچ گئی تھی لیکن اُسی کے ساتھ ان کی جرأت وہمت، سپاہیانہ اولو العزمی، شرافت خاندانی اور رندر بے پروائی کے قصے بھی ہر کس وناکس کی زبان پر ہیں۔ یہ خاندان اگرچہ دنیوی جاہ وثروت سے بہرہ اندوز نہ تھا اور گمنامی کے ساتھ منازل ہستی طے کرنے میں مصروف تھا لیکن ان صفات سے ضرور متصف تھا جو قصباتی زندگی کی تمام کلفتوں کا معاوضہ ہیں

ولادت، تربیت وتعلیم

اسی خاندان سے ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو وہ گوہرِ شب چراغ پیدا ہوا جس کی نورانی شعاعوں نے تاریک اٹاوہ ہی کو نہیں بلکہ تمام ہندوستان کو

روشن کر دیا۔ سیّد مہدی علی کو باپ (میر ضامن علی) کی طرف سے تو جہالت ترکہ میں ملی تھی مگر اُن کے نانا مولوی محمود علی ایک مشہور عالم تھے اور اسی دولتِ علم کی بدولت ملازمتِ سرکار انگریزی میں صدر الصدوری اور دربار ٹونک میں وزارت کی کرسی پر پہونچے اور شاید یہ اُن ہی کا اثر تھا کہ سیّد مہدی علی کی تعلیم و تربیت پر ابتدا ہی سے زیادہ توجہ کی گئی۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت سے تو اُس زمانہ میں کسی کے کان بھی آشنا نہ تھے۔ البتہ فارسی تعلیم دنیوی اور عربی تعلیم دینی ترقی کا زینہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ سیّد مہدی علی اوائل عمر میں تحصیل فارسی اور عربی میں مصروف ہوئے اور اپنی خداداد ذہانت سے چند ہی روز میں اتنی ترقی کر گئے کہ اٹاوہ میں کوئی اُن کا پڑھانے والا نہ رہا اور اس لئے ایک مشہور عالم مولوی عنایت حسین[1] کے سپرد کئے گئے جو قصبہ پھپوند میں رہتے تھے مولوی عنایت حسین کی تربیت سونے میں سہاگہ ہوگئی اور کچھ زمانہ نہ گزرا کہ سیّد مہدی علی کتب درسیہ سے فارغ ہو گئے۔ چوں کہ ابتدا ہی سے ذہن تیز اور طبیعت شوخ تھی اس لئے علم ادب سے سید مہدی علی کو خاص مناسبت تھی اور زمانہ طالب علمی ہی میں ان کے حافظہ میں برجستہ فارسی، عربی اشعار کا ایک اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا اور اولو العزمی نے کتب بینی کی طرف مائل کیا۔ یہی وہ چیزیں تھیں جنھوں نے آئندہ ان کے زورِ انشا، الفاظ پر قدرت اور فصاحت و بلاغت کی بنیاد ڈالی۔ شوقِ تعلیم کا تقاضا تھا کہ ابھی یہ مشغلہ جاری رہے مگر مخمصات حیات کب میلان طبع پر چلنے دیتے ہیں۔ خانگی مجبوریوں نے ذرائع معاش کی تلاش کی ضرورت پیدا کی اور زمانہ کے اقتضا اور شرافتِ خاندانی کے غلط تصوّر نے کمبخت چاکری میں جا پھنسایا۔

ملازمت

ابتدا میں معقول خدمت ملنے کے لئے قوی ذرائع اور با اثر سفارش کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ تو یہاں پہلے ہی سے مفقود تھے۔ مہینہ بھر کی جاں کاہی کا دس سفید ٹکلیاں جو حوائج ستّہ کی معمولی ضرورتوں کے لئے بھی کافی نہ تھیں معاوضہ ٹھیریں مگر ہمّت کی بلندی نے قسمت کی کوتاہی کا معاوضہ کیا اور اس ادنیٰ خدمت کو آئندہ ترقی کا زینہ قرار دیا۔ ان تھک

[1] مولوی سلامت اللہ صاحب کانپوری سے بھی فیضِ تربیت و تعلیم حاصل کیا تھا۔

محنت اور خیر خواہانہ کارگذاری نے افسر کو سرپرست بنا لیا۔ پھر کیا تھا ترقی کا راستہ کھل گیا اور ۲۰ سال کا سن بھی نہ ہوا تھا کہ محرری سے اہلمدی کی ذمہ دارانہ خدمت پر ترقی ہوئی۔[۱] مگر ابھی اطمینان سے کام کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں غدر کا پُر آشوب زمانہ آگیا جس نے چکاگو کے زلزلہ کی

غدر کی مصیبت اور خاندان کی وفاداری

طرح انگریزی حکومت کو بیخ و بُن سے ہلا کر سلطنتِ مغلیہ کے جھلملاتے چراغ کو دفعۃً ایسا روشن کر دیا کہ تھوڑی دیر کے لئے اکبر اور اورنگ زیب کا زمانہ یاد آنے لگا۔ مگر ساتھ ہی سارا تیل ہوا ہو گیا اور پھر ایسا اندھیرا گھُپ ہوا کہ صرف ملکہ وکٹوریہ کے نیرِ اقبال نے مطلع صاف کیا۔ یہ وہ سخت وقت تھا کہ انگریزوں پر زمین و آسمان تنگ و تار ہو گیا تھا اور بڑے بڑے وفادار دوست بھی دشمنِ جاں ہو گئے تھے مگر سید مہدی علی کے خاندان نے باوجودیکہ نواب فرخ آباد کے نائب نے بغاوت کی آگ اٹاوہ میں بھی مشتعل کر دی اپنی وہیمی چال قائم رکھی اور جادۂ اطاعت سے انحراف نہ کیا۔

---

[۱] نواب محسن الملک کا خاندان اس زمانہ میں شہر کے خاندانوں میں سب سے زیادہ باثر اور مقتدر تھا۔ خود اُن کے نانا اور ماموں بڑے مقتدر عہدہ دار تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں عام قاعدہ یہ تھا کہ ابتداءً دس روپیہ کی بلکہ بعض اوقات پانچ روپیہ ماہوار کی ملازمت ملتی تھی اور رفتہ رفتہ اس ملازمت سے ترقی پاتے تھے۔

نواب صاحب نے ایک مرتبہ خود مجھ سے بیان کیا تھا کہ جو حقیقی مسرت مجھے اس دس روپیہ کی ملازمت سے ہوئی تھی باوجود ہر قسم کی ترقی کے عمر بھر کبھی وہ مسرت نصیب نہیں ہوئی۔

دس روپیہ کی محرری سے ترقی ملنے کا یہ واقعہ ہے کہ ان کی یہ عادت تھی کہ بعد کچہری کے اور اکثر رات کو کچہری میں بیٹھ کر قانون یاد کیا کرتے تھے ایک دن کلکٹر کا گذر رات کے وقت احاطہ کچہری کی سڑک سے ہوا۔ اور کچہری میں خلاف معمول روشنی دیکھ کر تعجب ہوا۔ اُس نے آن کر شیشوں سے دیکھا کہ مہدی علی کچھ پڑھ رہے ہیں دروازہ کھلوا کر اندر گئے۔ دیکھا کہ قانون یاد کر رہے ہیں۔ اس کا خاص اثر ہوا اور فوراً ترقی دی (خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب مینیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ)

پیشکاری و سرشتہ داری

اور جب وہ پُر آشوب زمانہ جو آندھی کی شان سے اُٹھا تھا سیلاب کی سُرعت کے ساتھ فرو ہو گیا تو سید مہدی علی کے قدیم سرپرست مسٹر ہیوم نے اٹاوہ کی کلکٹری پر واپس آکر ان کو اپنا پیشکار بنایا اور ان کی کارگذاری سے خوش ہو کر اس کے ڈیڑھ سال بعد سرشتہ داری پر ترقی دی۔ سرشتہ داری اس وقت بھی اہل عملہ کی معراج سمجھی جاتی ہے اور بہت سے لائق اولو العزم عمال اسی دُھن میں لب گور پہنچ جاتے ہیں مگر نصیب نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو اُس وقت جب کہ زندگی کی لذتیں انسان کے لئے باقی نہیں رہتیں مگر اس باہمت نوجوان کو دیکھو کہ بے وسیلگی کی وجہ سے دس روپیہ کی نوکری ابتداءً قبول کی اور اپنی خداداد لیاقت، پُرجوش محنت، سلیقہ شعار اطاعت کیشی اور نمایاں کارگذاری کی بدولت تمام مدارج ترقی چند ہی سال میں طے کر کے اس اعلیٰ خدمت پر پہنچ گیا جس کی مٹھی میں تمام ضلع کی حکومت ہوتی ہے[1]

تحصیلداری و ڈپٹی کلکٹری

سرشتہ داری سے تحصیلداری پر ترقی دی گئی اور تحصیلداری ہی کی حالت میں ان کو ڈپٹی کلکٹری کے اختیارات مل گئے کیوں کہ وہ انتظامی اور قانونی قابلیتوں میں نہایت ممتاز تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے مال اور فوجداری کے متعلق اُردو میں بھی نہایت اعلیٰ درجہ کے چند رسالے تالیف کئے۔ مسٹر ہیوم اور مسٹر پالک کے زمانہ میں اُنھوں نے اٹاوہ میں بہت سی جدید سڑکیں اور سرکاری عمارتیں تعمیر کرائیں۔ شفاخانہ ہائی اسکول، تحصیل، منصفی اور کوتوالی کی شان دار عمارتوں کے علاوہ ہیوم گنج کی تعمیر بھی نواب صاحب ہی کے ذوقِ سلیم پر مبنی ہے۔ غرض نواب صاحب نے اٹاوہ کو ایک قصبہ کی حیثیت سے نکال کر خوش نما شہر بنا دیا۔ ۱۸۶۲ء میں اُنھوں نے امتحان مقابلہ ہائر اسٹنڈرڈ میں کامیابی حاصل کی اور اول نمبر رہے۔ ۱۸۶۷ء میں بمشاہرہ تین سو چالیس روپیہ مرزا پور کے ڈپٹی کلکٹر بندوبست ہو گئے۔ ان سرکاری فرائض کے ساتھ ہی ساتھ ریاست دودھی کی سپرنٹنڈی اور

---

[1] مضمون مولوی عزیز مرزا مرحوم۔ از دکن ریویو۔ جنوری ۱۹۰۳ء

راج بڑہل کے کورٹ آف وارڈس کی ممبری کے فرائض بھی متعلق ہوئے۔ انھوں نے مرزاپور میں بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیں۔ کلکٹر نے ان کی بابت اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ:-

"میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مہدی علی سے زیادہ ذہین، مستعد اور ایمان دار ملازم صوبہ ممالک مغربی و شمالی میں نہیں ہے"۔

انتظام قحط و خلعت

سنہ ۱۸۶۹ء میں جب قحط کی مصیبت رونما ہوئی ہے تو مولوی مہدی علی نے نہایت ہمدردی، انتظامی قابلیت اور مستعدی سے اپنے متعلقہ فرائض کو ادا کیا اور کمشنر الہ آباد نے گورنمنٹ میں سفارش کر کے خلعت دلوایا۔

حسن کارگذاری پر مسٹر ہیوم کا نوٹ

ڈپٹی کلکٹری کے زمانہ میں جب اُن کے حیدرآباد جانے کی کارروائی شروع ہوگئی تھی اس وقت مسٹر ایلن ہیوم نے اُن کی سروس بک میں نہایت تعریفی نوٹ لکھا[۱]۔

---

[۱] جو کہ مولوی مہدی علی کے چال چلن و لیاقت کا تجربہ ہم کو بہت عرصہ سے ہے اس لئے ہم اُن کے حال کو اپنے دفتر میں لکھنے سے تامل نہیں کرتے۔ مشار الیہ ان سب عہدہ داروں میں جنھوں نے اب تک میری ماتحتی میں کام کیا۔ کیا ہندوستانی اور کیا انگریز لیاقت میں بڑھ کر اور رکھتا ہے ذہانت، محنت، عقل، فراست، مستعدی، چالاکی، ہوشیاری اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور اس وسعت کے ساتھ کہ شاید اور کسی شخص میں یہ صفتیں یکجا جمع نہ ہوئی ہوں۔ کیسا ہی نیا اور مشکل اور دقیق کام جو اس سے ہم نے لیا ہے اس میں ہم نے صرف خاص خاص ہدایت کردی اور اس نے نہایت خوبی سے جلد اور خاطر خواہ لائق پسند کے کر دکھایا ہم کو ان کے حقوق کا بڑا خیال ہے اور اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ ان کی ترقی اور بہبودی ہونی چاہئے تو اس کو ہم کسی طرح اپنی عبارت میں لا نہیں سکتے کہ کس طرح بیان کریں لیکن نہایت تعجب کی بات ہے کہ باوجود اس اعلیٰ درجہ کی لیاقت اور کارگذاری کے ایسا شخص کہ جو ایک ریاست اور صوبہ کا انتظام نہایت عمدہ طور پر کر سکتا ہے بہ نسبت اس کے جیسا کہ اکثر ریاستوں میں اب ہے اور پھر وہ ایسے ذلیل عہدہ پر اب تک بنا رہا جیسا کہ عمدہ تحصیلداری و ڈپٹی مجسٹریٹی کا ہے اور وہ لوگ جو اس سے سب صفتوں میں کمتر ہیں عمدہ اور معزز عہدے پاتے جاویں اب وہ عنقریب نوکری سرکار انگریزی سے استعفا دینا چاہتے ہیں اس لئے کہ ان کی لیاقت کا اب تک کوئی نتیجہ اس سرکار سے

(بقیہ صفحہ آئندہ)

حیدرآباد کے لئے سرسیّد کی سفارش

کونسل آف ریجنسی کے زمانہ میں جب سالار جنگ اوّل کو شمالی ہندوستان کے قابل اصحاب کی خدمات سے فائدہ اُٹھانے کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے سرسیّد سے بھی مشورہ کیا۔ سرسید چوں کہ مولوی مہدی علی کی خداداد قابلیتوں اور ان عمدہ خدمات سے جو کہ انھوں نے انگریزی ملازمت میں انجام دی تھیں پورے طور پر واقف تھے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کی سفارش کی جس کو سر سالار جنگ نے منظور کیا لیکن مولوی مہدی علی نے خواہش کی کہ سرکار انگریزی سے اُن کی خدمات کا استعارہ کر لیا جائے۔ سر سالار جنگ نے استعارہ پسند نہ کیا اور سرسید کو لکھا کہ:۔

"ایک شخص دو آقاؤں کا ملازم نہیں ہو سکتا۔ اگر مولوی مہدی علی کو ہماری گورنمنٹ پر اعتماد ہے تو مستعفی ہو کر آجاویں۔

ابتدائی تقرر

چنانچہ ۷۳-۱۸۷۲ء میں مولوی مہدی علی نے ڈپٹی کلکٹری سے استعفا دے دیا اور حیدرآباد میں "مجوزہ کارروائی" کے عہدہ پر ممتاز ہوئے یہ ایک جدید عہدہ تھا جو ان ہی کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔

جو زمانہ کہ انگریزی ملازمت میں گذرا تھا سالار جنگ نے بہ مراعاتِ خاص اس کو سرکار نظام کی ملازمت میں شامل کر کے دورانِ ملازمت مسلسل کر دیا۔

تنظیم محاسبی

"مجوزہ کارروائی" کے زمانہ میں اُن کی توجہ تمام تر محاسبی کی تنظیم پر مبذول رہی۔ زیادہ تر وقت ترتیب حسابات اور ملک کی مالی حالت دریافت کرنے میں صرف ہوا۔ ان ہی کی تحریک سے اصلاحات کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس نے دو تین سال پیہم کام کیا اور مالی حالت کے متعلق نہایت قابلیت سے نقشے تیار کئے اور اس طرح

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) نہ ملا اور اب وہ اچھی سرکار میں معزز ترین عہدہ پر مقرر ہو گئے ہیں۔ میری دلی تمنا یہ ہی کہ ان کو ہر طرح کی بہبودی نصیب ہو اور وہ بڑے نامور اور معزز صاحب دولت ہوں۔ اگرچہ یہ قول درست ہے کہ آدمی کے اختیار میں نہیں ہے کہ خود کسی کو بہبودی پہنچاوے گو اور لوگ بھی دنیا میں ترقی کے لائق ہیں اور یہی میری آخری دعا ہی (منقول از علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ)

تنظیم محاسبی کا ایک مضبوط ڈھانچہ تیار ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں ۱۲۸۸ فصلی سے موازنہ (بجٹ) مرتب اور طبع ہونا شروع ہوا۔

معتمدی مال گزاری

چند دن "مجوزہ کارروائی" کے عارضی عہدہ پر رہنے کے بعد بندوبست کا کام تفویض کیا گیا اور ۱۸۷۶ء میں "معتمد مال گزاری" کے عظیم المرتبت عہدہ پر فائز ہوئے۔

قابل مددگاروں کا انتخاب

چوں کہ اس وقت حیدرآباد کے باشندے معیار مطلوبہ کے مطابق تعلیم یافتہ نہ تھے اس لئے مجبوراً مولوی مہدی علی کو اپنی امداد کے لئے مختلف مقامات سے بہت سے قابل اصحاب کو سرکار عالی کی سروس میں داخل کرنا پڑا۔ ان لوگوں میں گیا پرشاد۔ رگھوناتھ پرشاد۔ مسٹر ڈنلاپ (سی آئی ای) مولوی نذیر احمد دہلوی مسٹر ولمٹ (نواب سر فریدوں دولہ) فریدوں جی جمشید جی (کے سی ایس آئی) بہت ہی نام آور ہیں جنہوں نے حیدرآباد کے نظم ونسق اور اصلاحات کے نفاذ میں بڑی امداد دی۔

بندوبست

اس وقت تک تحصیل مال گزاری کا بہت سی اصلاحات کے بعد بھی جو سرسالار جنگ نے کی تھیں کوئی قابل انتظام نہ تھا۔ نظمار جمعبندی سالانہ تعلقات مفوضہ میں ہر موضع کی بذات خود بہ مواجہہ رعایا فصل کی جانچ پڑتال کر کے تشخیص جمع کرتے تھے تاہم نظمائے جمعبندی اور زراعت پیشہ رعایا کے درمیان ہمیشہ دقت اور کشمکش کا سامنا رہتا تھا۔ سرسالارجنگ کو اس ناقص اور تکلیف دہ طریقۂ وصول مال گذاری سے ایک قسم کی بے چینی تھی۔ انھوں نے مولوی مہدی علی کی قابلیت سے فوراً فائدہ اٹھایا اور ۱۲۸۶ھ ۱۲۹۲ھ میں بندوبست کا کام جاری کر دیا گیا۔ مولوی مہدی علی نے سمت جنوبی میں نمونۃً ضلع اورنگ آباد کا بندوبست شروع کیا۔ بمبئی پریسیڈنسی اور برار کے اصول پر پیمائش اراضی اور تشخیص وغیرہ کر کے رعیت واری کا طریقہ جاری کیا۔ بعدہٗ بتدریج کل اضلاع میں بذریعہ سروے پیمائش کا کام نہایت صحت کے ساتھ شروع کرایا گیا اور ۱۸۸۲ء تک اس کا چارج اُن ہی کے سپرد رہا۔

انتظام پر اعتراضات

جس وقت یہ کام شروع ہوا ہے تو اُن پر اعتراضات کی اس قدر بوچھار ہوئی کہ سر سالار جنگ کو بھی اس کی ناکامیابی کا خیال پیدا ہونے لگا اس وقت اگرچہ سر سالار جنگ پورے اختیارات کے ساتھ ریاست کے انتظام اور اصلاحات پر متوجہ تھے لیکن ایک شدید تعصب اور سخت فرقہ بندی جس نے کچھ عرصہ پہلے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی موجود تھی - عام طور سے جن ہندوستانی عہدہ داروں کو سر سالار جنگ نے انتخاب کیا تھا ان کے خلاف بعض با اثر افراد بلکہ جماعتوں کی طرف سے رعایا میں تعصب پیدا کیا جاتا تھا ان کے کاموں پر بیجا اور نامناسب نکتہ چینی کی جاتی تھی اصلاحات کو شک وشبہ سے دیکھا جاتا تھا اور اخبارات میں بھی بدنام کیا جاتا تھا - ان سب میں مولوی مہدی علی کے ساتھ بہت زیادہ تعصب تھا -

مشکلات پر قابو

لیکن مولوی مہدی علی ان تمام مشکلات پر غالب آ گئے اُنھوں نے سالار جنگ کا کافی اطمینان کرا دیا کہ اگر کام استقلال کے ساتھ ہوگا تو کامیابی یقینی ہے اور پھر اعتراضات خود بخود دور ہو جائیں گے -

سر رچرڈ میڈ کے ایک خط کا اقتباس

ان ہی حالات کی بنا پر ۱۸۷۴ء میں سر رچرڈ میڈ نے جو حیدرآباد کے مشہور رزیڈنٹ تھے لکھا تھا کہ :-

"میں کامل ترین اعتماد رکھتا ہوں کہ آپ ہز ہائنس نظام کی گورنمنٹ اور اُن کے ملک کی رعایا کی اعلیٰ درجہ کی جاں نثارانہ خدمات انجام دیں گے ....

اگرچہ ہندوستان سے جو افسر یہاں آئے ہیں اُن کو جو دقّتیں پیش آئی ہیں اُن کا آپ نے اپنی دماغی قوت اور اصابت رائے سے قابل اطمینان طریقہ سے استیصال کر دیا ہے - لیکن اس میں شک نہیں کہ جب یہاں کی رعایا یہ سمجھ لے گی کہ اُن کو ملک ورعایا کی بہبودی پیش نظر ہے اور یہ ایمان داری سے بے لاگ کام کرتے ہیں تو اُن کی جاں فشانی کو قدر کی نگاہوں سے بھی دیکھے گی -

نتیجۂ بندوبست

مولوی مہدی علی نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی محنت و قابلیت اور مملکتِ نظام کی اصلاح کے بے لوث خدمات سے مخالفین کی زبانیں بند کردیں اور دکن میں وہ کام کیا جو ممالک مغربی شمالی میں ٹامسن صاحب لفٹنٹ گورنر نے اور مدراس میں منرو صاحب گورنر نے اور بمبئی میں ونگیٹ نے کیا تھا - اُنھوں نے آمدنی کو مستقل اور جائز محصولات قائم کر کے محفوظ کیا اور دوسری طرف رعایا کو حقوق دلوائے اور لگان و مال گزاری کی ایک معتدل شرح معیّن کی - انھوں نے یہ اصول قائم کردیا کہ جس وقت کسی ضلع کے ایک تعلقہ کی پیمائش ختم ہوتی جلد سے جلد جدید شرح لگان مقرر کردی جاتی اور چوں کہ یہ شرح نہایت منصفانہ ہوتی تھی اس لئے رعایا کو فوراً اطمینان بھی حاصل ہوجاتا اور زراعت کی ترقی کی طرف اس کو توجہ ہوجاتی اور یہ تشخیص ایسے عمدہ طریقہ سے کی گئی کہ کل قابل زراعت زمینوں کو مزارعین نے نہایت شوق سے لیا اور متصلہ علاقۂ انگریزی کی رعایا بھی اس ملک میں آکر آباد ہونے لگی - زراعت میں اس قدر ترقی ہوئی کہ منجملہ ۳۴ لاکھ روپیہ کے جو اس انتظام پر صرف ہوا چند ہی سال میں ستّائیس لاکھ روپیہ اسی مد سے وصول ہوگیا اور مال گذاری کا ننانوے فی صدی حصّہ وقت پر وصول ہونے لگا -

مسٹر ڈنلاپ نے ایک رپورٹ میں لکھا تھا کہ :-

"کہ مجھے اس بات کے کہنے میں مطلق تامّل نہیں کہ مرہٹواری کے اضلاع میں بندوبست کا کام احاطۂ بمبئی کے اصول پر ختم ہوچکا ہے وہاں کی رعایا کی حالت جہاں تک کہ مالی انتظام سے تعلق ہے سرکار انگریزی کی رعایا کے مساوی ہر زمین کے قبضہ کے متعلق حقوق کی محافظت اور پرتہ مال گزاری کے لحاظ سے ان اضلاع کی رعایا علاقۂ انگریزی کی رعایا سے کسی طرح کم نہیں"

اخراجات میں بھی کافی کفایت شعاری ملحوظ رکھی گئی اور دو آنہ فی ایکڑ کے حساب سے زیادہ خرچ نہیں ہوا جو علاقہ سرکار انگریزی (مدراس) کے اوسط سے بھی بہت کم تھا

سروے کی رپورٹ

اُنھوں نے ۱۸۸۲ء میں سروے کے متعلق ایک رپورٹ بھی تیار کر کے مشتہر کر دی جو ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور جس میں علاقہ سرکارعالی کے حالات و انتظام اراضی پر کافی روشنی ڈالی گئی۔

رپورٹ پر سر اسٹوارٹ بیلی کا تبصرہ

آنریبل سر اسٹوارٹ بیلی کے سی ایس آئی۔ سی آئی ای لفٹنٹ گورنر بنگال اور سابق رزیڈنٹ حیدرآباد نے پوری رپورٹ کو غور کے ساتھ پڑھ کر لکھا کہ:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے نہایت مفید کام شروع کیا اور اس کو نہایت کامیابی سے چلایا۔ بلاشبہ ایک کامیاب حکومت کے لئے یہ سنگِ بنیاد ہی اور آپ کو یہ سُن کر اطمینان ہوگا کہ اس لحاظ سے حیدرآباد صوبۂ بنگال کے اُن اضلاع سے جن میں دوامی بندوبست ہی بہتر ہے اور ہندوستان کے نہایت ترقی یافتہ اضلاع سے بہت زیادہ پیچھے نہیں ہے"۔

گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کا نوٹ

ہز اکسلنسی وائسرائے لارڈ ڈفرن نے بھی اس رپورٹ کو ملاحظہ کیا اور سکریٹریٹ سے رزیڈنٹ حیدرآباد کو مطلع کیا گیا کہ:۔

"گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے اس یادداشت کو دلچسپی سے ملاحظہ کیا اور مجھے اس خواہش کے ظاہر کردینے کا ارشاد ہوا ہے کہ گورنر جنرل اس ترقی کی قدردانی کا اظہار کرتے ہیں جو ریونیو سروے میں حکومتِ نظام نے کی ہی اور جس سے مولوی سید مہدی علی کی کارگذاری پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے"۔

مجلسِ مالگذاری

ان ہی انتظامات کے سلسلہ میں بہ عہد سالارجنگ ثانی مجلس مالگذاری قائم کی گئی۔ اگرچہ اسی قسم کی ایک مجلس بہت پہلے قائم ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے کوئی قابل الذکر کام نہیں کیا تھا۔ اب مولوی مہدی علی کی رائے پر مجلس کا دوبارہ انعقاد ہوا جس کے مشہور ارکان میں مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی اور نواب وقار الملک بھی تھے لیکن ۱۲۹۷ف فصلی

میں پھر مجلس شکست کردی گئی اور صوبجات جدید کا انتظام عمل میں آیا اور انتظام مالگذاری کو مستقل اور مضبوط کرنے کے لئے ایک جدید محکمہ انسپکٹر جنرل مال کا قائم ہوا اور اس پر مسٹر ڈنلاپ مقرر کئے گئے۔

یہ اصلاحات مال گذاری تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ اُن تمام صیغوں پر حاوی تھیں جو معتمدی مالگذاری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ صیغہ کرورگیری اور محکمۂ انعام قابل الذکر ہیں۔

کرورگیری (کسٹم ڈیوٹی)

ہر ملک میں یہ محکمہ بھی آمدنی کے لحاظ سے نہایت اہم محکمہ ہے۔ سرکار عالی میں اس کا انتظام تعہد (ٹھیکہ) کے طور پر کیا جاتا تھا لیکن مولوی مہدی علی نے ۱۸۸۵ء میں بجائے تعہد (ٹھیکہ) کے امانی میں انتظام کیا اور اس کی نگرانی کے لئے ایک عہدہ دار کا بنام تعلقہ دار کرورگیری تقرر کیا گیا۔

صیغۂ انعام

سرکار عالی میں بہ کثرت ایسی معافیاں تھیں کہ جن کی اسناد کا پتہ نہ تھا یا یہ کہ اسناد سے زیادہ رقبہ پر قبضہ تھا۔ سر سالار جنگ اول نے اس کی تحقیقات پہلے محکمۂ مال کے سپرد کی۔ پھر اس غرض سے ایک مجلس مقرر ہوئی اور بالآخر بحیثیت معتمد مال یہ کام مولوی مہدی کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ حقیقۃً یہ ایک نہایت مشکل اور دیر طلب کام تھا اور نواب صاحب نے اس کے اصول قائم کرنے میں بڑی سخت محنت کی لیکن جب وہ سالار جنگ ثانی کے زمانہ میں پولیٹکل و فنانشل سکرٹری ہوئے تو ایک علیحدہ محکمہ کمشنری انعام کے نام سے قائم کردیا گیا۔

دفاتر کی اصلاح

مولوی مہدی علی کے اصلاحی کاموں میں تہذیب دفاتر کا کام بھی بہت اہم ہے جب ۱۸۷۷ء میں مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کا تقرر ہوا ہے تو اُن کو دورہ کرکے معائنۂ دفاتر کا حکم دیا گیا۔ اُنھوں نے دورہ کیا اور دفاتر کی حالت کے متعلق مفصّل اور مبسوط رپورٹیں پیش کیں چنانچہ ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں:-

"کسی علاقہ کا دفتر مرتب نہیں ہے۔ دفتر بڑے نہیں ہیں لیکن ابتری اس قدر ہے

کہ بیان نہیں ہوسکتی ۔ ہر محکمہ میں عملہ اور کارکُن کافی ہیں لیکن ہر شخص کی یہی آرزو ہے کہ اور زیادہ ہوں ۔ علاقۂ انگریزی میں ہماری پیشی میں دو ہی ایک آدمی ہوتے تھے اور یہاں جب حاکم کرسی پر اجلاس کرتا ہے تو اس کے گرد عملہ جمع ہو جاتا ہے کوئی جواب نویس ہے، کوئی احکام نویس، کوئی صاف نویس، کوئی زود نویس، کوئی تلنگی نویس، کوئی مرہٹی نویس ۔ اہلکاروں کو سررشتہ اور دفتر میں امتیاز نہیں ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اجلاس تو آباد ہے مگر سررشتہ خراب اور دفتر تباہ۔ اہلکاران پیشی الگ الگ کاغذات کو محافظ دفتر کے پاس پھینک دیتے ہیں اور محافظ دفتر پر مصیبت آجاتی ہے اور جب ان کاغذات کی پھر تلاش ہوتی ہے تو بہت وقت صرف ہو جاتا ہے ۔

اس ضلع کے دفاتر کی ابتری اس قدر ہے کہ اگر مختصر حالت ہی لکھی جائے تو خود ایک دفتر ہو جائے ۔

محافظ دفتر شاید ہی کوئی ہو جو مثل اور مقدمہ کے مفہوم کو بھی جانتا ہو۔ انتہائی بے تمیزی سے چند کاغذات کو سی لیا ہے اور اس کا نام مثل ہے اور ان کاغذات کی تعداد نہ تو مثل سے معلوم ہوتی ہے اور نہ فہرست دفتر سے ۔ اگر فہرستوں کو ناقص و ناتمام کہا جائے تو یک گونہ تعریف ہے ۔ علاوہ بریں فارسی، مرہٹی تلنگی کے اختلاط سے یہ حالت ہے کہ ایک ہی معاملے کے چند کاغذ فارسی میں اور چند تلنگی وغیرہ میں ہوتے ہیں اور پھر سب جُدا جُدا رکھے جاتے ہیں"۔

اسی طرح ایک ضلع کے دفتر مال گذاری کی تنقیحی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ :-

"اسکیل[۱] اور آیاپٹی[۲] کا طریقہ اس ملک کے انتظام مال گذاری کی پیشانی پر ایک

---

[۱] "اسکیل" انگریزی لفظ ہے بمعنی پیمانہ ۔ سرکار نظام کے دیہات میں زر مال گزاری کی وصولی کے لئے ایک عہدہ دار رہتا ہے ۔ جسے پٹیل کہتے ہیں اور ان لوگوں کے حقوق وطن دارانہ اور متوارث ہوتے ہیں (بقیہ حاشیہ نمبر ۱ و ۲ بر صفحہ آئندہ)

داغ ہے اور اس خرابی سے عمّال کو خیانت کا بڑا موقع حاصل ہے"۔[1]

اصلاحات

ان بالواسطہ اطلاعات کے علاوہ مولوی مہدی علی نے بذات خاص بھی دوروں میں حالت کا معائنہ کیا[2] - اور جب پوری حالت معلوم ہوگئی تو انھوں نے اس کی اصلاح کی طرف توجہ کی - عہدہ داروں کے مواجب اور مشاہرات میں اضافہ کرایا۔ ضرورت کے لحاظ سے عملہ کا تعیّن کیا اور مناسب حال مشاہرات مقرر کئے - اسلحہ اور کاغذات کی باقاعدہ ترتیب کرائی گئی اور ہر صیغہ کے بستوں کے جُدا جُدا رنگ تجویز کیے گئے - دری - جاجم اور گدّوں کے فرش کو میز، کرسی اور مناسب وضروری فرنیچر سے تبدیل کیا گیا - اہلکاروں اور عہدہ داروں کو اپنا وقار قائم رکھنے کا پابند اور ذمہ داریوں کا احساس کرایا گیا اور سختی کے ساتھ نگرانی قائم ہوئی تاآں کہ یہ غیر مرتّب اور غیر مہذّب دفاتر ترتیب وتہذیب کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہوگئے - انھوں نے اس حالت کے رفع کرنے کے لئے جو کوششیاں جاری کی ہیں وہ تاریخ نظم ونسق ملکی میں نہایت اہم درجہ رکھتی ہیں -

---

(بقیہ حاشیے صفحہ گزشتہ) دونوں وصول مال گذاری کے مشترکہ ذمہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ پولس پٹیل بھی رہتا ہے جو گاؤں کے حفظ وامن کا نگراں رہتا ہے - ان لوگوں کو بطور معاش وصول زر مال گذاری پر فی صدی دس روپیہ ملتا ہے - اسی معاش کا نام اسکیل ہے کیوں کہ اس کی قرارداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے -

[2] آیا پٹی - پٹی بمعنی ٹیکس - آیا پٹی اس ٹیکس کو کہتے ہیں کہ جو زر مال گذاری پر فی روپیہ آدھ آنہ کے حساب سے رعایا سے وصول کی جاتی ہے - یہ حق پٹواری اور پٹیل کا ہوتا ہے -

[1] اصل رپورٹیں فارسی میں ہیں ہم نے ملخّصًا ترجمہ درج کردیا ہے -

[2] رائے چور کے مقام پر نواب محسن الملک بہادر نے دفاتر کی خرابی کا تذکرہ کیا تھا کہ جب پہلی مرتبہ میں یہاں معائنہ کو آیا اور دفتر دیکھنا چاہا تو محافظ دفتر نے کہا کہ :-

"حضور بستوں میں سپولئے ہیں میں دفتر کیسے دکھاؤں"۔

مجھے اس پر اعتبار نہیں آیا لیکن جب بستے منگا کر اور کھول کر دیکھے گئے تو فی الواقع سپولئے موجود تھے ۱۲

مسٹر کاڈری کا ریمارک

۱۸۸۶ء میں مسٹر کاڈری رزیڈنٹ نے جن کو اپنے عہدہ کی حیثیت سے پہلی حالت بھی معلوم تھی گلبرگہ اور اورنگ آباد کے دفاتر کا معائنہ کیا اور اس معائنہ سے جو اثر ان پر ہوا اس کو انھوں نے بمقام گلبرگہ نظام سول سروس کے ڈنر کے موقع پر اپنے جامِ صحت کی جوابی تقریر میں اس طرح ظاہر کیا کہ :-

"چوں کہ مجھ کو یہاں اور اورنگ آباد میں دفاتر سرکاری کے معائنہ کرنے کا موقع ملا ہے اس لئے میں نہایت خوشی کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جس طریقہ سے ترتیب و تہذیب دفتر ہوئی ہے اور جس صحت کے ساتھ کہ کاغذات پیمائش و بندوبست جن پر عایا کی بہبودی کا دار ومدار ہے اور جس طور سے کہ نقشہ جات کی تنقیح و تصحیح ہوتی ہے اور جس تیزی و سُرعت کے ساتھ محافظ خانہ سے کاغذات مطلوبہ پیش کئے جاتے ہیں اور جس پابندی اور عمدگی کے ساتھ آج تک کے حسابات رکھے گئے ہیں وہ نہایت عمدہ اور قابل تعریف ہے ۔یہی اعلیٰ درجہ کی صفتیں ہیں اور یہی اہم امور انتظامی ہیں جو باعث استحکام ریاست ہوتے ہیں اور جن پر کہ انتظامِ سلطنت کا دار ومدار ہے اور یہی ترقی کا دار ومدار ہیں"۔

قحط کی سختی اور اس کا انتظام

مولوی مہدی علی کے ان کاموں میں جو نقشِ دوام حاصل کر لیتے ہیں ۔ حیدرآباد میں ۱۸۷۷ء کے قحط کا انتظام ہے ۔ یہ قحط نہایت سختی کے ساتھ انگریزی علاقۂ دکن اور مغربی کرناٹک میں رونما ہوا اور حیدرآباد کا علاقہ بھی زد میں آگیا ۔منجملہ (۱۷) اضلاع کے (۷) تعلّقوں میں جن کا رقبہ ۳۴ ہزار میل مربع تھا انتہائی آفت تھی اس رقبہ کی مردم شماری ۳ لاکھ ۶۰ ہزار تھی جس کا اوسطی مربع میل (۱۶۰) آدمیوں کا تھا ۔سر سالار جنگ اوّل نے ۱۸۷۶ء میں ہی اس خطرہ کا اندازہ کر کے انتظامات شروع کر دئے تھے اور مولوی مہدی علی کو اس کارِ خاص پر مامور کیا تھا ۔

مجلس انتظام قحط اور اس کی معتمدی

دار الریاست میں ایک کمیٹی صدر مجلس کے نام سے قائم کی گئی جس کے

صدر سر سالار جنگ کے بھانجے نواب مکرم الدولہ اور معتمد مولوی مہدی علی مقرر ہوئے ممبروں میں ہر قوم و ملّت کے آدمی شریک کئے گئے۔

تدابیر — مولوی مہدی علی نے نہایت انہماک کے ساتھ کام شروع کیا جو اضلاع کہ زیادہ سختی سے متاثر نہ ہوئے تھے اُن کو محفوظ رکھنے کی تدابیر کیں۔ ضابطہ کارروائی عہدہ داران ماموربہ کارِ قحط اور دیگر قواعد وضوابط مرتب کئے اور قحط زدہ رقبوں میں فیاضی کے ساتھ امدادی کام جاری کئے جن میں شوارع اور آب رسانی کے ذرائع یعنی کنوؤں اور تالابوں وغیرہ کی درستی کی گئی اور نئی تعمیر پر خاص لحاظ رکھا گیا۔ شرح اجرت ایسی مقرر کی گئی کہ ہر ایک جوان شخص روزانہ مزدوری سے ایک سیر جوار خرید لیتا۔ یہ شرح انگریزی علاقوں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ محتاجوں اور معذوروں کے لئے دارالمساکین اور محتاج خانے قائم کئے گئے۔ غلّہ کی درآمد برآمد پر بغیر کسی تجارتی دست اندازی کے بڑی توجہ رکھی گئی اور یہ امر طے کر لیا گیا کہ ہر ممکن طریقہ سے محض غذا نہ ملنے سے موت واقع ہونے کو روکا جائے گا قحط زدہ رقبوں میں کافی طور پر غلّہ پہنچایا گیا اور نہ صرف علاقہ سرکار نظام کو غلّہ کے انتظام سے فائدہ پہنچا بلکہ علاقہ سرکار انگریزی میں بھی غلّہ بھیجا گیا۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء کے پانچ ماہ میں صرف گلبرگہ اور رائچور کے اسٹیشنوں سے بذریعہ جنوبی ریلوے گیارہ لاکھ من سے زیادہ غلّہ روانہ ہوا اور پھر بھی ایک بڑی مقدار روانگی کے لئے موجود تھی۔

۶۔ فروری ۱۸۷۷ء تک (۲۸۷۲۸) آدمی ممالک سرکار عالی میں علاقہ انگریزی سے آکر امدادی کاموں میں مصروف ہوئے اور علاقہ سرکار عالی سے علاقہ انگریزی میں (۹۵۲۴) آدمی گئے اور اسی تاریخ تک (۹۴۱۳۷۷) آدمیوں کو مدد مل چکی تھی[1]۔

ہر جگہ حفظانِ صحت کا کافی انتظام عمل میں لایا گیا۔ صرف چند مقامات پر ہیضہ اور چیچک کی شکایت ہوئی لیکن ان امراض نے وبائی صورت اختیار نہیں کی۔

---

[1] یہ اعداد اکسٹرا آرڈنری گزٹ آف انڈیا مطبوعہ ۱۳ فروری ۱۸۷۷ء سے ماخوذ ہیں۔

سر رچرڈ ٹمپل کا معائنہ اور رپورٹ

علاقہ سرکار عالی میں جو انتظامات ہوئے تھے ان کو جنوری ۱۸۷۷ء میں گورنمنٹ ہند کے نمائندہ کی حیثیت سے سر رچرڈ ٹمپل نے اضلاع گلبرگہ ورائچور میں معائنہ کیا۔ اس معائنہ کے وقت معتمد مجلس ہمراہ تھے اور ہر ایک انتظام کو پوری تفصیل کے ساتھ معائنہ کراتے تھے اور ہر ایک انتظام پر صاحب موصوف تحسین کرتے تھے۔

اس معائنہ کی رپورٹ سر رچرڈ ٹمپل نے گورنمنٹ آف انڈیا میں بھیجی جو غیر معمولی گزٹ مطبوعہ ۱۳ فروری میں شائع ہوئی۔ اس میں نواب صاحب کے متعلق یہ ریمارک ہے کہ:۔

”قحط زدوں کی دستگیری کا اہتمام معتمد مدارالمہام علاقۂ مال گزاری کے متعلق ہے چنانچہ معتمد مذکور سے بہت حالات دریافت ہوئے۔ یہ صاحب جب کہ ڈپٹی کلکٹر تھے تب بھی ۱۸۶۹ء کے قحط میں، قحط کے امدادی کاموں میں شریک تھے اور اس وجہ سے اُن تدبیروں سے خوب واقف ہیں جو سرکار انگریزی میں قحط زدوں کی دست گیری کے لئے کی جاتی ہیں۔“

انتظامات قحط میں (۱۳۷۵۵۰۷) روپیہ صرف ہوا اور اس صرف میں بمقابلہ فنانشل حالت کے قحط زدوں کی مصیبت کم کرنے کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا۔

قحط زدہ مقامات میں مال گذاری بھی کم کردی گئی اور اس طرح کمی مال گذاری اور اخراجات کی میزان (۳۲۵۹۱۸۹) ہوئی۔

کمیشن انسداد قحط میں شہادت

وبائے قحط دفع ہونے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب سے ایک کمیشن اس غرض سے قائم ہوا کہ قحط زدہ ممالک میں ضروری تحقیقاتیں کرکے آیندہ کے لئے رائے لکھے۔ یہ کمیشن حیدرآباد بھی آیا اور مولوی مہدی علی نے سوالات کمیشن کے جوابات نہایت شرح وبسط اور اعلیٰ قابلیت کے ساتھ دئے۔ اس کمیشن کے پریسیڈنٹ سر چارلس ایلیٹ تھے جو بعد کو بنگال کے لفٹنٹ گورنر ہوئے انھوں نے اپنی رپورٹ میں ان جوابات کی خاص تعریف کی۔

قحط اور تدابیر کی رپورٹ

مولوی مہدی علی نے قحط کی ایک مفصل رپورٹ بھی تیار کی جس کو (۱۷) ابواب پر تقسیم کیا اور سالہائے گزشتہ کے قحطوں سے جو ملک میں ہو چکے تھے ابتدا کرتے ہوئے اس امر کو ظاہر کیا کہ ملک اس مصیبت کے برداشت کرنے کے لئے جو اس پر مسلط تھی کس قدر قابلیت رکھتا تھا ان ذرائع و تدابیر کو تفصیل کے ساتھ دکھایا جو قحط زدوں کی امداد کے لئے اختیار کی گئیں۔ کمیشن کے سوالات کے جوابات بھی اس رپورٹ کے دوسرے حصّہ میں درج کئے گئے اور اس کو طبع کرا کے شائع کرایا۔

رپورٹ پر اخبارات کا تبصرہ

ممتاز اخبارات نے اس رپورٹ پر ناقدانہ تبصرے کئے اور مولوی مہدی علی کے حُسنِ انتظام کی داد دی۔ ان تبصروں میں سے پانیر اور ٹائمس کے تبصروں کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

پانیر:-

"ایک دیسی حاکم کے لئے جو حقیقتاً قابل ہو علاقہ نظام میدانِ عمل اور میدان ترقی ہے۔ مثلاً مہدی علی ہیں جنہوں نے اس صوبہ میں بیس سال کی ملازمت میں اپنے آپ کو محض بندوبست میں ڈپٹی کلکٹری (جنوبی مرزاپور میں) کے قابل پایا۔ وہ دکن میں اُترے اور ایسی کامیابی حاصل کی کہ حکومت حیدرآباد کے ریونیو سکرٹری ہو کر ایسی رپورٹ شایع کی ہے جو شاید محکمہ وضع قانون کی آتشِ رشک کو بھڑکائے گی۔ اُنھوں نے مہربانی کر کے ہم کو دو مضمون بھیجے ہیں جن میں سے ایک تو سنہ ۱۸۷۶-۷۷ء والے قحط کی تاریخ ہے اور دوسرے میں کمیشن کے سوالات کے جوابات ہیں۔ قحط محدود تھا اور ۱۶ صوبوں میں سے صرف ۶ صوبے اثر پذیر ہوئے تھے۔ قحط کا مقابلہ بالکل انگریزی اصول پر کیا گیا۔ غلّہ کی برآمد بند نہیں کی گئی۔ نحیفوں کے لئے دارالمساکین اور طاقت والوں کے لئے کارخانے قائم کئے گئے ......

...... اس قسم کے واقعات بیان کرنے

میں جدّت کی گنجائش نہیں ہے لیکن کمیشن کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے سید مہدی علی نے نہایت قابلیت اور ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے اس حصّہ کو سوالات اور جوابات کی صورت میں ترتیب دیا گیا ہے اور کہیں کہیں جوابات میں ''جیسا موقع ہو'' کا طرز اختیار کیا گیا ہے لیکن مختصراً یہ کہ امیدوار امتحان میں شان کے ساتھ کامیاب ہوا ہے''۔

ٹائمس آف انڈیا:۔

''اور مصنفین زیر بحث کے مقابلہ میں مولوی مہدی علی سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور علاقہ حیدرآباد کے قحط کی پچھلی ڈھائی صدی کی تاریخ لٹریری نقطۂ نظر سے اس مضمون میں سب سے زیادہ دلچسپ تصنیف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے قحط کے سلسلے میں ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست نے کس قدر ترقی کی ہے ....

مولوی مشتاق حسین کی طرف سے شکریہ

انتظاماتِ قحط کے سلسلہ میں محتاج خانوں کو بہت وسیع پیمانہ پر قائم کیا گیا تھا - اور اس کا انتظام مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) کے سپرد تھا۔ جب قحط کی مصیبت رفع ہوگئی تو مولوی مشتاق حسین نے محتاج خانوں کے متعلق ایک مبسوط رپورٹ تیار کرکے مجلس کے سامنے پیش کی جس میں منتظمین کا شکریہ بھی ادا کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مولوی مہدی علی کا ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا ہے کہ :۔

''دریں شکریۂ ارباب مجلس صرف محبّت و دوستیِ قدیم معتمد مجلس موصوفہ کہ با من بودہ است مرا از ذکر خاص باز می دارد ورنہ در شکریۂ مولوی سید مہدی علی صاحب کہ معتمد و در حقیقت جان صدر مجلس انتظام قحط علاقہ سرکار عالی بودہ اند انصاف مقتضی آں بود کہ بسیار سخن سرائیہا می کردم''۔

سالار جنگ کا انتقال اور تردد و کشمکش کا زمانہ

اگرچہ سر سالار جنگ نے ۱۸۵۳ء سے ہی (یعنی جب کہ نواب ناصرالدولہ آصف جاہ رابع نے ان کو منصبِ وزارت

پر فائز کیا)، اُسی وقت سے اصلاحات نظم ونسق ملکی پر اپنی توجہ مبذول کردی تھی لیکن غدر کی مصیبت اور اس کے بعد کے واقعات نے اصلاحات کی رفتار کو سُست کر دیا تھا اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے گرد وپیش ایسے قابل آدمی نہ تھے جو ان کی منشا ومقاصد کی خاطر خواہ تکمیل کر سکتے اس لئے اس قدر کامیابی نہ ہوئی جس کے وہ خواہاں تھے مگر جب سے کہ اُنھوں نے شمالی ہند اور دیگر مقامات سے حسب مراد آدمیوں کو جمع کرلیا۔ اصلاحات کی رفتار تیز ہوگئی اور اس کے نتائج بھی سامنے آنے لگے تاہم ابھی بہت سی اصلاحات جن پر وہ غور کر چکے تھے نفاذ پذیر نہ ہوئی تھیں کہ ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ مطابق ۸ فروری ۱۸۸۳ء کو تین دن کی علالت کے بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔

اس حادثہ سے خاندان امیر کبیر[۱] کی مدار المہامی کے متعلق پچھلی رقابتیں از سرِ نو تازہ ہوگئیں اور یہ رقابتیں اس لئے اور زیادہ باعثِ تشویش تھیں کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس نابالغ تھے۔

لارڈ رپن کی ہمدردی اور ریجنسی کا قیام

مگر لارڈ رپن نے فوراً سر اسٹوارٹ بیلی کو ضروری ومناسب انتظامات کے لئے کلکتہ سے حیدر آباد بھیجا اور سر اسٹوارٹ نے اپنے سابقہ تجربہ سے فائدہ اُٹھا کر نہایت ہمدردانہ توجہ کی اور وسیرائے کی منظوری سے میر لائق علی خاں (خلف اکبر سر سالار جنگ) اور راجہ نریندر پرشاد پیشکار (نبیرۂ راجہ چندو لال) اور نواب سر آسمان جاہ کو مشترکہ منتظم سلطنت قرار دے کر عارضی طور پر ایک ریجنسی قائم کردی۔

مولوی مہدی علی کا ارادہٴ واپسی سر اسٹوارٹ بیلی اور رزیڈنٹ کا مشورہ

سر سالار جنگ کے اور دگانِ خاص کے لئے یہ زمانہ نہایت انتشار وتردد کا تھا اور مولوی مہدی علی بھی اس تردد و انتشار سے خالی نہ تھے[۲]

[۱] حیدر آباد میں بہت مشہور خاندان ہے جس کے امراء امرائے پائگاہ کہلاتے ہیں

[۲] اس حالت کا نقشہ خود مولوی مہدی علی نے اپنی ایک تقریر میں اس طرح کھینچا ہے:

وہ ایک اندوہناک بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور ہر ایک کی زبان پر تھا کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے اور یہ وہ درد انگیز وقت تھا کہ حیدر آباد کی تاریخ کے صفحے اس سے ہمیشہ سیاہ رہیں گے۔ ریاست کا ناخدا خدا کے پاس چل بسا تھا۔ جہاز کے مالک نے سنِ رُشد پر نہ پہنچنے کے سبب سے اُسے اپنے ہاتھ میں نہ لیا تھا۔ جہاز کا کوئی لایق چلانے والا اور ان اندوہناک طوفانی موجوں میں سے اس کو صحیح وسالم طور پر

اُنھوں نے ارادہ کیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں لیکن سر اسٹوارٹ بیلی نے اُن کو اس ارادہ سے باز رکھا اور مسٹر ڈبلیو بی جونس رزیڈنٹ نے ان کو لکھا کہ :-

"آپ حیدرآباد سے چلے جانے کا خیال ہرگز دل میں نہ لائیے یہ بات بالکل نامناسب ہوگی - آپ سر اسٹوارٹ بیلی کی عمدہ رائے پر کاربند ہو جیئے ....

.... مجھے پورا پورا یقین ہے کہ نواب مرحوم (سالار جنگ) کی وفات کے وقت سے اب تک آپ نے سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کر رکھا ہے جس کی غرض یہ تھی کہ نئے انتظام میں بامصالحت کارروائی ہو .... میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس ریاست کی سرسبزی کے لئے اپنی قابلیت صرف کرتے رہیں گے - اور سر اسٹوارٹ بیلی کی صلاح پر کارروائی کرنے سے آپ صرف اپنی سرکار ہی کی خوشنودی حاصل نہ کریں گے بلکہ عوام کی نظروں میں بھی اس کی قدر ہوگی -

سالار جنگ کے معتمدین خاص اور ہوا خواہانِ سلطنت اور عامۂ رعایا کی خواہش و آرزو تھی کہ میر لائق علی خاں اپنے نامور باپ کے جانشین ہوں تاکہ مرحوم کی اصلاحی اسکیموں کا عمدگی کے ساتھ نفاذ ہو سکے - اگرچہ اس کے متعلق کہ اس موقع پر مولوی مہدی علی نے کیا اور کس قابلیت کے ساتھ حصہ لیا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے لیکن وہ کامل ترین اثر جس کے باعث میر لائق علی خاں کے زمانہ وزارت میں مولوی مہدی علی خاں نے (اپنے الفاظ میں) حیدرآباد کی خدائی کی اس امر کا یقین کرنے کے لئے کامل اور کافی وجہ ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کنارے تک کوئی پہنچانے والا تھا - چاروں طرف سے مصیبت اور دہشت کی خوفناک موجیں اس سے ٹکراتی تھیں - جہاز والے بے یار و مددگار اپنی تباہی کے سامان دیکھ دیکھ کر ہمہ تن شکل تصویر بن گئے تھے - ہر شخص اپنی اپنی جان کی خیر مناتا تھا اور جو دن آتا تھا ایک تازہ مصیبت اور ایک نئی آفت اپنے ساتھ لاتا تھا۔"

کہ انھوں نے اس معاملہ میں دیگر معتمدین کی نسبت کچھ زیادہ ہی حصہ لیا۔[1]

اس نازک موقع پر سب سے زیادہ تردد یہ تھا کہ مسٹر جے جی کاڈری جو سالار جنگ کی وفات کے دو ماہ بعد قائم مقام رزیڈنٹ ہو کر آئے تھے اس بات کے ساعی تھے کہ جہاں تک ممکن ہو شمالی ہند کے قابل نوجوانوں کو جنھیں سر سالار جنگ نے انتخاب کیا تھا علحدہ کر دیا جائے لیکن لارڈ رپن کی فیاضانہ پالیسی نے ان تمام تردداتِ کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے مناسب نہ جانا کہ اب زیادہ دن تک مسندِ حکومت کو خالی رکھا جائے پہلے انھوں نے دسمبر ۱۸۸۳ء کلکتہ میں اعلیٰحضرت کو مدعو کر کے ملاقات کی اور پھر ایک ماہ بعد خود حیدر آباد آ کر بتاریخ ۷ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ مطابق ۵ فروری ۱۸۸۴ء اعلیٰحضرت کو مسندِ آبائی پر تمکن کیا۔

اسی دن بعد ظہر اعلیٰ حضرت نے میر لائق علی خاں کو منصبِ وزارت پر سرفراز فرمایا۔ اور "مختار الملک" کا موروثی خطاب مع خطاب عماد السلطنت کے عطا کیا۔

فنانس اور پولٹیکل سکرٹری کے عہدہ پر مولوی مہدی علی کا انتخاب

عنانِ وزارت ہاتھ میں لینے کے بعد ہی میر لائق علی خاں (مختار الملک عماد السلطنت) نے ایک جدید عہدہ محکمۂ پولٹیکل و فنانس کا قائم کر کے مولوی مہدی علی کو اس کا معتمد مقرر کیا اور اس محکمہ کے متعلق حسب ذیل صیغے رکھے گئے:

(۱) مداخل و مخارج
(۲) ترتیب تختہ جات و کیفیات نظم و نسق ملکی۔
(۳) گزیٹر
(۴) دار الطبع
(۵) ترجمہ رپورٹ و دیگر کاغذات سرکاری۔
(۶) داخلہ احکام ضروری
(۷) اشاعت احکام عام

---

[1] میر لائق علی خاں کے مدار المہام مقرر کرانے میں مولوی مہدی علی خاں کا زبردست حصہ تھا چنانچہ ان کے مدار المہام ہونے پر مولوی مہدی علی نے ایک پرائیویٹ خط بھی لکھا تھا کہ اپنے محسن کے احسان کا بدلہ سوائے اس کے اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا تھا کہ میں میر لائق علی خاں کی مدار المہامی کے لئے انتہائی کوشش کروں۔

(۸) امورِ سیاسی

اس عہدہ پر مامور ہونے کے بعد عملاً حکومت کی پوری طاقت اُن کی ذات میں مجتمع ہوگئی "مہدی علی خاں" اور "قوت واقتدارِ حکمرانی" مرادف لفظ بن گئے۔

خطاب جنگی

۲۲ مارچ ۱۸۸۴ء کو دربار نوروز کی تقریب پر اعلیٰحضرت نے مولوی مہدی علی خاں کو "مُنیر نواز جنگ بہادر" کا خطاب اور دو نیم ہزاری ذات و پانصد سوار کا منصب مع نشان کے مرحمت فرمایا۔

تجاویز اصلاحات کا اجرا

نواب صاحب نے پہلے صیغہ فنانس کی اصلاحات پر خاص توجہ کی۔ یہ کام ان کے لئے نیا نہ تھا۔ انھوں نے "مجوز کارروائی" کے زمانہ میں ہی حسابات کو طرز جدید میں لانے کے متعلق سعی کی تھی اور ان کی تحریک پر ایک مجلس بھی قائم کی گئی تھی اب وسیع اختیار اور آزادی و تجربۂ ملکی کے ساتھ اُنھوں نے فنانس کی اصلاحات کیں۔

جنوری ۱۸۸۵ء میں بہت سی اصلاحات جو مرسالار جنگ اول کے وقت کی مجوّزہ تھیں نواب منیر نواز جنگ کی نگرانی میں جاری کی گئیں اور ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ کو اصلاحات و انتظامات امور سلطنت کے متعلق ایک جامع اور مبسوط اعلان جاری ہوا جو نواب منیر نواز جنگ کی اعلیٰ قابلیتوں کا مظہر تھا۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے نہایت قابلیت اور محنت سے گورنمنٹ حیدرآباد کی پہلی انتظامی رپورٹ تیار کرکے شائع کی۔ اُنھوں نے کمیشن قرضہ آب پاشی تلنگانہ اور دیگر مختلف اہم معاملات و اصلاحات میں سخت جانفشانی کی۔

مسٹر کاڈری کا اعتراف

نواب صاحب کی ان محنتوں اور جاں فشانیوں کا اعتراف رزیڈنٹ بھی برابر کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء میں مسٹر کاڈری نے جو سالار جنگ کے خاص معتمدین کے زبردست مخالف رہ چکے تھے ایک پبلک اسپیچ میں کہا تھا کہ:۔

"آپ سب لوگ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ جو انتظام قلمرو سرکار نظام میں جاری ہے

اور جس انتظام نے کہ مدار المہام مرحوم کی عاقلانہ اور اُن کے فرزند کی مسلسل اور متواتر تائید سے حیدرآباد کے نام اور اس کی شہرت کو اس درجہ بڑھایا ہے ایک بڑی حد تک مُنیر نواز جنگ کی ہمہ تن کوششوں کا نتیجہ ہے"۔

وزیر اور اعلیٰ حضرت میں کشیدگی اور یورپین چیف سکرٹری کا تقرر

لیکن بدقسمتی سے وزیر کے گرد کچھ ایسے لوگ بھی جمع تھے جن کے اثر اور خراب مشوروں سے وزیر نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا اور رزیڈنسی کی اخلاقی مدد اور حمایت کے بھروسہ پر اُن سے وہ افعال سرزد ہوئے جو وزارت کے مرتبہ اور حدود کے باہر تھے۔ اعلیٰ حضرت کو پہلے ناگواری پیدا ہوئی اور پھر اس ناگواری نے رنجش کی صورت اختیار کرلی مگر چوں کہ یہ خیال ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ اس شدید برہمی کا باعث اعلیٰ حضرت کی پیشی کے معتمد اور بعض وہ اُمرا و عہدہ دار ہیں جو وزیر کے زوال میں اپنا عروج سمجھتے ہیں اور ہیزم کشی کرکے اعلیٰ حضرت کے مزاج میں زیادہ برہمی کا باعث ہوتے ہیں اس لئے نواب صاحب نے تجویز کی کہ اعلیٰ حضرت کی پیشی میں ایک یورپین پرائیویٹ سکرٹری ہو جو عہدہ داروں کی فرقہ بندی سے علٰحدہ رہ کر ایمان داری کے ساتھ کام کرے تاکہ یہ جھگڑے نہ پیدا ہوں۔ رزیڈنٹ کی بھی یہی رائے تھی لارڈ ڈفرن نے بھی صفائی اور ناگواری دور ہونے کی کوشش کی اور کرنل مارشل کا جو پنجاب میں ڈپٹی کمشنر تھے معتمد پیشی کے عہدہ پر تقرر ہوا مگر حالات میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔

عماد السلطنت کا استعفا

بالآخر ۱۰ر اپریل ۱۸۸۷ء مطابق ۱۴ر رجب ۱۳۰۴ھ کو وزیر نے استعفا پیش کردیا اور اُن کی جگہ سر آسمان جاہ مقرر کئے گئے۔

نواب صاحب کے لئے یہ ایک نہایت خطرناک زمانہ تھا اُن کو یہ عروج و اقتدار جو آج تک حیدرآباد میں ضرب المثل ہے نواب عماد السلطنۃ کے سبب سے حاصل ہوا تھا اب وہ مخالف پارٹی کی وجہ سے معرضِ خطر میں تھا۔ دوسری طرف جو ذاتی و سرکاری تعلقات ۱۳ سال سے نواب عماد السلطنۃ کے نامور باپ اور خود اُن کے ساتھ تھے ان حالات اور اعلیٰحضرت

کی سخت برہمی مزاج کے باعث اُن کے منقطع ہو جانے کا اندیشہ تھا لیکن نواب صاحب نے اس خطرہ کو بھی کامل استقلال فراست اور اعلیٰ درجہ کے تدبر وہوشیاری سے رفع کیا اور اعلیٰحضرت اور نواب عماد السلطنت کا اعتماد بدستور قائم رہا۔

محسن الدولہ محسن الملک کا خطاب

چنانچہ نواب صاحب کی خدمات اور قابلیتوں کے صلہ میں ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۰۴ھ کی تقریب دربار نوروز پر اعلیٰحضرت نے نواب محسن الدولہ محسن الملک" کا خطاب مرحمت کر کے اپنی خوشنودیِ مزاج اور قدردانیِ خدمات کا اظہار فرمایا۔

عماد السلطنت کا اظہار اعتماد

نواب صاحب کی نسبت عماد السلطنت کا جو خیال اُن تعلقات کے زمانہ میں تھا مستعفی ہونے کے بعد اس میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی اور استعفا دینے کے بعد بھی نواب صاحب کی تمام خدمات اور دیانت وراست بازی اور وفاشعاری کا شکریہ ادا کیا۔ اور بطور یادگار ایک طلائی گھڑی قیمتی ایک ہزار روپیہ عنایت کی۔

اس سے زیادہ اعتماد کا اظہار ہم اُس خط میں دیکھتے ہیں جو عماد السلطنت نے نواب صاحب کو لکھا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"آپ نے جو خدمات میرے والد مرحوم کے زمانۂ وزارت میں انجام دی ہیں اور جو امداد اُن کو آپ سے ملی ہے اُس کا اندازہ اور قدر تو صرف وہی کر سکتے تھے وہ آپ کو اپنا صادق دوست اور سچا بہی خواہ تصور کرتے تھے۔ آپ کو اُن پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے آپ کا ذکر اپنے وصیت نامہ میں بھی خاص طور پر کیا ہے۔ میرے زمانۂ وزارت میں بھی آپ نے مجھے ایسی بیش بہا امداد دی ہے جس کی میں کسی عزیز قریب سے بھی توقع نہیں رکھتا ہوں۔ میں آپ کا اس مخلص امداد پر شکر گذار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا اور آپ کی خدمات کا نقش میرے دل سے محو نہیں ہو گا۔"

سر آسمان جاہ کی وزارت کا اعتماد

عماد السلطنت کے بعد ذی قعدہ ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں نواب سر آسمان جاہ وزارت پر فائز کئے گئے اس انقلاب میں اُن

کے اختیار و اقتدار میں کمی آگئی اور مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) کو جو عماد السلطنت کے زمانہ میں صوبہ دار تھے عروج حاصل ہوا تاہم نواب محسن الملک کی قابلیت و ذہانت کی سر آسمان جاہ نے پوری قدر کی اور اُن پر اپنا اعتماد قائم رکھا۔

کمیشن قرضہ کی ممبری

گورنمنٹ نظام پر عرصے سے ساہوکاروں کے قرضہ کا بہت بڑا بار تھا۔ جس کی مقدار چھ کروڑ، ۲۷ لاکھ ۹۲ ہزار بتلائی جاتی تھی اور جس میں نصف کے قریب سود تھا۔ ان قرضوں میں ایک حصہ تو اس قسم کے قرضہ کا تھا جو گورنمنٹ نے خود لیا تھا اور ایک حصہ ایسا تھا جس کی نسبت گورنمنٹ خواہ مخواہ ضامن متصور کی جاتی تھی۔ مثلاً کسی ساہوکار نے گورنمنٹ سے وصولیابی قرضہ میں امداد کی درخواست کی اور اس درخواست پر لفظ منظور لکھ دیا گیا اس بنا پر قرضہ مندرجہ درخواست کو گورنمنٹ کا کفالتی قرضہ متصور کر لیا گیا۔ ان قرضوں کے متعلق ہمیشہ شکایات رہتی تھیں۔ رزیڈنسی میں بھی درخواستیں پیش ہوئیں۔ کئی دفعہ تحقیقات بھی عمل میں آئی لیکن تصفیہ نہ ہوا اور کارروائیاں ناتمام رہیں۔ اب تین عہدہ داروں کی ایک مضبوط کمیٹی اس کے تصفیہ کے لئے قائم کی گئی۔ نواب محسن الملک بھی اس میں ممبر مقرر کئے گئے چوں کہ ان قرضوں کا تعلق صیغۂ فنانس سے تھا اس لئے نواب صاحب کو دونوں ہم جلیسوں کے مقابلے میں سخت محنت کرنی پڑی اور ایک سال کے اندر اندر ان تمام قرضوں اور دعووں کا قابل اطمینان تصفیہ ہو گیا جس کو وزارت، رزیڈنسی اور قرض خواہوں نے تسلیم کیا۔

ٹھیکہ معدنیات کی چالاکیوں کا انکشاف

اس زمانہ میں نواب صاحب نے معدنیات کے ٹھیکہ میں جو چالاکیاں ہوئی تھیں اور جس سے گورنمنٹ نظام کو بہت بڑا مالی نقصان پہنچا تھا اُن کا پردہ فاش کیا۔ یہ ٹھیکہ سر سالار جنگ اوّل کے زمانہ میں ۱۸۸۳ء میں سردار عبدالحق (دلیر الدولہ دلیر جنگ) ہوم سکرٹری[1] کی وساطت سے ۹۹ سال کے لئے

---

[1] یہ ایک معمولی ملازم تھے لیکن سر رچرڈ میڈ رزیڈنٹ کی سفارش سے اُنھوں نے ترقی کی اور پھر اپنی ذہانت سے وہ ہوم سکرٹری کے عہدہ پر مقرر ہوئے اُن کا اثر گورنمنٹ آف انڈیا اور فارن آفس میں قائم ہو گیا تھا۔ ۱۸۸۵ء

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

لندن میں ہوا تھا اور اس کا مسودہ ایک ماہرِ قانون لارڈ میگناٹن اور مشیرانِ قانونی کی ایک مستند کمپنی نے تیار کیا تھا جس میں مسٹر ولیم واٹسن اور جان اسٹوارٹ کو ہر قسم کے معدنیات پر حقوقِ اجارہ دیئے گئے تھے اور کام کرنے کے لئے ایک کمپنی کی تشکیل کی گئی تھی - ان شرائط و قواعد پر بہ حیثیت محافظ حقوق ریاست رزیڈنٹ مسٹر کاڈری گورنمنٹ ہند اور انڈیا آفس نے غور کر کے ضروری ترمیمات کیں اور معاہدہ ۱۸۸۵ء میں مکمل ہو گیا اور ۷ جنوری ۱۸۸۶ء کو اس پر دستخط ہو گئے - کام کرنے کے لئے دکن مائننگ کمپنی قائم ہو کر درج رجسٹر ہوئی - دس لاکھ پونڈ کا سرمایہ ایک لاکھ حصوں میں قرار دیا گیا جن میں پندرہ ہزار حصے فروخت ہو گئے اور ان کی نصف قیمت وصول ہو گئی باقی ۸۵ ہزار حصص جن کی قیمت تمام اغراض کے لئے ادا شدہ سمجھی گئی ٹھیکہ داروں نے حقوق اجارہ منتقل کرنے کے معاوضہ میں لئے ان حصوں میں سے سرسالار جنگ کو بھی بقدر ربع حاصل ہوئے جو پہلے ان ہی ٹھیکہ داروں کے نام تھے اور انھوں نے عبد الحق کے نام منتقل کر کے اُن کے ساہوکاروں کے پاس رکھوا دئے - ۱۸۸۷ء میں جب کہ عبد الحق بہ حیثیت جوبلی کمشنر کے لندن میں تھے تو انھوں نے حیدر آباد میں نواب محسن الملک کے سامنے ایک یادداشت پیش کی جس کا مفاد یہ تھا کہ گورنمنٹ نظام بھی دکن مائننگ کے حصص خریدے نواب صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں جب نظام گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے فروخت ہوئی ہے تو انھوں نے ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ بطور کمیشن حاصل کیا۔ ۱۸۸۷ء میں نظام گورنمنٹ کے وکیل کی حیثیت سے ملکہ معظمہ کی جوبلی میں شریک ہونے کے لئے لندن گئے اور وہاں ۷۵ لاکھ روپئے جنرل ڈیفنس ورک کے لئے اعلیٰحضرت کی طرف سے پیش کیا جو اس وقت بصورت نقد منظور نہیں ہوا - مگر بعد کو امپیریل سروس ٹروپس کے نام سے ایک فوج قائم ہو گئی۔ اس آفر پر انگلش پریس نے گورنمنٹ ہند پر بڑی نکتہ چینی کی اور پارلیمنٹ میں بھی سوالات ہوئے - کہا جاتا ہے کہ کرنل مارشل کی تحریک سے یہ آفر ہوا اس لئے کرنل صاحب کی نسبت انگلستان میں اچھے خیالات نہ تھے اور ہندوستان کے بعض انگلو انڈین اخبارات نے بھی بہت سے اعتراضات کئے وہ برابر عبد الحق کی تائید کرتے رہے اور یہی خیال رہا کہ وہ مظلوم ہے اور لوگ اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں - رفتہ رفتہ اُن کے متعلق بھی اعلیٰحضرت کا اعتماد زائل ہو گیا اور اُن کو مستعفی ہونا پڑا -

نے اس پر کچھ اعتراض بھی کئے لیکن چوں کہ مسٹر کرنل مارشل اور مسٹر کاڈری رزیڈنٹ سردار عبدالحق کی تجویز کے بڑے موّید تھے، اعلیحضرت کی منظوری حاصل کی گئی کہ دس ہزار حصص بحساب ۲ پونڈ فی حصہ خرید لئے جائیں۔ چنانچہ عبدالحق نے مشہور و معروف دلالوں کی معرفت خریداری کا انتظام کیا اور ایک دلال کی معرفت کھلے بازار (اسٹاک ایکسچینج) میں دس ہزار حصے گورنمنٹ نظام کے لئے خریدے گئے۔ اس خرید و فروخت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پبلک کی توجہ بھی خریداری حصص کی طرف راغب ہوگئی اور بڑے بڑے لوگوں نے خریداری کی۔ لیکن گورنمنٹ نظام کے لئے وہی حصے خریدے گئے جن کو عبدالحق نے اجارہ داروں سے حاصل کیا تھا۔ اس شہرت سے کہ خود گورنمنٹ نظام اپنے لئے حصے خرید رہی ہے اُن دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ پہونچا جن کے پاس مفت کے حصے تھے لیکن اس سے معدنیات کا کام جس طرح کہ جاری ہونا چاہئے تھا نہ ہو سکا اور جو کچھ جاری ہوا اس میں گورنمنٹ نظام کے مفاد کو بُری طرح قربان کیا گیا۔ سردار عبدالحق کے حصص کے متعلق اکتوبر ۱۸۸۸ء میں ایک شخص جوزف راک نے جو انگلستان میں گورنمنٹ نظام کا ایجنٹ تھا نواب محسن الملک سے مخبری کی تو نواب صاحب نے سردار عبدالحق سے دریافت کیا لیکن اُنھوں نے انکار کیا اس کے چھ ماہ بعد پھر رزیڈنسی میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں رزیڈنٹ اور کرنل مارشل اور نواب وقار الامرا شریک ہوئے۔ یہاں بھی انھوں نے انکار ہی کیا اور ورڈ آف آنر دیا کہ کوئی حصے نہیں ہیں۔

اسی دوران میں انگلستان سے مسٹر مورٹن فریون ہندوستان کی سیر و سیاحت کے سلسلے میں حیدرآباد بھی آئے۔ خزانہ کے متعلق وہ ایک بڑے ماہر تھے اور اُن کی قابلیت کا یہاں بھی شہرہ ہو چکا تھا۔ نواب صاحب نے عبدالحق کے کاغذات تنقیح کی غرض سے اُن کے سپرد کئے۔ فریون صاحب کے لئے یہ بہت ہی معمولی اور مرغوب کام تھا اُنھوں نے تنقیح کر کے اپنے نتائج تنقیح قلمبند کر دئے یہ تنقیح بغرض مشورہ مسٹر نارٹن بیرسٹر کلکتہ، کے پاس جو تمام ہندوستان کے مقننین میں سب سے بہتر مقنن سمجھے جاتے تھے مع ضروری کاغذات وغیرہ کے بھیج دی

گئی اور اُنھوں نے فریون صاحب کے نتائج کی تائید کرکے وضاحت کے ساتھ اپنی رائے لکھی اور عبدالحق کو دغا کا مجرم قرار دیا اور اس رپورٹ اور مشورہ کی بنا پر عبدالحق معزول کردئے گئے۔

لندن میں تحقیقاتی کمیٹی کا انعقاد

یہ واقعات جب پریس میں آئے تو لندن میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ ہاؤس آف کامنز میں سوالات ہوئے۔ آخرکار سکریٹری آف سٹیٹ نے ۳ مئی کو ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جس کو گواہوں اور دستاویزوں کی طلبی کا اختیار دیا گیا اور کمیٹی نے وکلا کے پیش ہونے کی بھی اجازت دے دی اس کمیٹی کے سامنے گورنمنٹ نظام، عبدالحق اور کمپنی کو اپنے اپنے دعاوی و حقوق کی پیروی کے لئے طلب کیا گیا۔

نواب محسن الملک کا پیروی وغیرہ کی غرض سے لندن جانا

گورنمنٹِ نظام نے نواب محسن الملک کو مع مسٹر نارٹن بیرسٹر کے پیروی کے لئے منتخب کیا اور نواب صاحب اوّل ہفتہ مئی ۱۸۸۸ء میں لندن روانہ ہوئے۔ نواب سر فریدوں جنگ بہادر بہ حیثیت پرائیویٹ سکرٹری اور مسٹر نارٹن بہ حیثیت مشیر قانون اور بعض دیگر عہدہ دار معاون و مددگار کے طور پر اُن کے ساتھ تھے

اخبارات کا شوروغل

اس مقدمہ نے ایک خاص اہمیت اختیار کرلی تھی لندن کے اخبارات کے کالموں میں روزانہ اس کے متعلق بحثیں ہوتی تھیں۔ کوئی گورنمنٹ آف انڈیا پر الزام قایم کرتا تھا اور کرنل مارشل اور عبدالحق پر سخت حملے کرتا تھا۔ کوئی گورنمنٹ نظام کی کارروائی کو راست بازی کے خلاف محوّل کرتا تھا۔ بہت سی بے بنیاد افواہیں اُڑتی تھیں اور بعض اشرار نے مشہور کر رکھا تھا کہ انڈیا آفس بھی اس کارروائی میں شریک ہے۔

پالیسی کا اظہار

ان اخبارات کے مضامین سے اس غلط فہمی کا اندیشہ بھی تھا کہ نظام گورنمنٹ، گورنمنٹ آف انڈیا اور رزیڈنٹ کے خلاف منشا کام کرتی ہے۔ اس لئے نواب صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی گورنمنٹ کی پالیسی کا صاف صاف اظہار کردیا۔

نواب صاحب ۲۲ مئی کو پیرس پہونچے وہاں مسٹر مورٹن فریون اور نواب

فتح نواز جنگ[1] ان کے استقبال کے لئے موجود تھے نواب صاحب نے مسٹر فروین پر اپنی گورنمنٹ کے خیالات ظاہر کر دیئے۔ اُنھوں نے کہا کہ آئندہ غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی غرض سے میرے لئے ضروری ہے کہ میں صاف طور پر آپ کو یہ بتا دوں کہ ہز ہائنس، وزیر اور دیگر ارکان حکومت کی مقررہ پالیسی یہی ہے کہ کوئی کام ایسا نہ کیا جائے جو رزیڈنٹ حیدرآباد، گورنمنٹ آف انڈیا اور انڈیا آفس کے خلاف مرضی ہو اور یہ کہ ہمارے تمام کام حکومت بالا کے ایما کے مطابق ہوں۔ انگریز لوگ آئینی طور پر آزاد اور خود مختار واقع ہوئے ہیں اس لئے انھیں تعلقات کا پتہ

---

[1] نواب مہدی حسن خاں فتح نواز جنگ منجملہ اُن عہدہ داروں کے تھے جن کو سرسالار جنگ اوّل نے انتخاب کیا تھا۔ یہ فتح پور ضلع بارہ بنکی کے باشندے اور اودھ میں منصف تھے۔ حیدرآباد میں عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) کے میر مجلس و چیف جسٹس تھے ۱۳۰۴ھ میں بتقریب دربار نوروز اعلیحضرت نے فتح نواز جنگ کا خطاب مرحمت کیا تھا۔ فروری ۱۸۸۸ء میں بہ حصول رخصت انگلستان گئے اور وہیں ریلوے اور معدنیات کے ڈائرکٹر مقرر کئے گئے تھے اور بعد کو جب نواب محسن الملک واپس آگئے تو گورنمنٹ نظام کے ہوم سکرٹری مقرر ہوئے اور اُن کو ہدایت کی گئی کہ انگلستان میں ریلوے اور معدنیات کے کام کا تجربہ حاصل کریں اس کے علاوہ اُنھوں نے انگلستان کے دوران قیام میں بیرسٹری کی سند بھی حاصل کر لی تھی اور وہ انر ٹمپل میں ابتدائی امتحان سے معاف کر دیئے گئے تھے۔ وہ انگلستان کے نہایت ممتاز طبقوں اور سوسائٹیوں میں نہایت احترام کے ساتھ مدعو کئے جاتے تھے۔ سرکاری تقریبات اور درباروں میں عزت کے ساتھ شامل ہوتے تھے اعلیٰ انگلش سوسائٹی اور انگلش پریس پر ان کو خاص رسوخ حاصل تھا۔ اُن کے مختلف مضامین تمام اوّل درجہ کے اخبارات میں نمایاں طور سے شایع ہوتے تھے اور وہ ان کے مداح و معترف تھے۔ ہندوستان اور حیدرآباد کے معاملات پر اُن کی تقریریں دلچسپی سے سُنی جاتی تھیں۔ سرکاری حلقوں میں اور خاص کر انڈیا آفس میں اُن کا بہت کچھ وقار تھا۔ لارڈ لینسڈون نے جب ویسرائے ہو کر ہندوستان آ رہے تھے اُن سے ایک گھنٹہ تک ملاقات کی اُنھوں نے ایک انگلش لیڈی سے جو ہندوستان ہی میں تھیں شادی کر لی تھی اور اس سبب سے وہ انگریزی آداب و معاشرت سے بھی بخوبی واقف ہو چکے تھے۔

بالآخر اُن کے خلاف سازشی کارروائیاں ہوئیں اور انھوں نے بھی بعض اہم غلطیاں کیں اس لئے معطل ہو کر چند دن بعد علحدہ کئے گئے۔

نہیں جو حکومت ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے مابین ہیں اور نہ وہ اس طریقہ کو ماننے کے لئے تیار ہیں جس سے کہ ہم کو اپنے وفود اور وکلار کو حکومت کی مرضی کے مطابق بنانا پڑتا ہے۔

مجھے نواب سر آسمان جاہ نے قطعی احکام دئے ہیں کہ کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے گورنمنٹ ہند پر عموماً اور ارکانِ حکومت پر خصوصاً برا اثر پڑے اور یہ کہ ہمیں اپنے آپ کو صرف اسی مطالبہ تک محدود رکھنا چاہئے کہ ہمیں اس نقصان کا معاوضہ مل جائے جو ہماری گورنمنٹ کو ہمارے افسران کے طریقہ عمل کی وجہ سے برداشت کرنا پڑا نیز ہمیں ہر قسم کی پارٹی اسپرٹ اور ذاتی مخاصمت سے گریز کرنا چاہئے۔ ہم اس کو کسی طریقہ سے بھی فائدہ خیز خیال نہیں کرتے کہ ہاؤس آف کامنز میں سوالات اٹھائے جائیں جس سے برٹش گورنمنٹ کے کسی افسر کے چال چلن پر کوئی اثر پڑے۔

پھر انھوں نے لندن میں اسی پالیسی کو ایک دعوت کے موقعہ پر سر رچرڈ میڈ سابق رزیڈنٹ اور مسٹر بٹین ریلوے اور مائننگ کمپنیوں کے پریسیڈنٹ کے سامنے بھی بیان کیا اور اس شورش پر جو اخبارات میں ہو رہی تھی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ اسی طرح مارشنس آف سالسبری کی پارٹی میں جب نواب صاحب ممتاز اصحاب سے ملے تو وہاں بھی دورانِ گفتگو میں ان ہی خیالات کا اظہار کیا۔

اعلیٰ عہدہ داروں سے انٹرویو

نواب صاحب نے بڑے بڑے عمائدین اور ارکانِ حکومت، انڈیا آفس کے عہدے داروں، لارڈ کراس، وزیر ہند، سر جے گارسٹ نائب وزیر ہند اور بالخصوص ان لوگوں سے جن کا تعلق اس کمپنی کے معاملات سے تھا ملاقاتیں کیں اور ان سب پر صاف اور واضح طریقہ سے اپنی پالیسی کو ظاہر کر دیا۔

لارڈ کراس نے نواب صاحب کو نظام گورنمنٹ کا نمائندہ تسلیم کر کے بہت اطمینان دلایا اور وعدہ کیا کہ انڈیا آفس نظام گورنمنٹ کے حق میں جو کچھ بہترین مدد کر سکتا ہے وہ اُس کے لئے ہر وقت آمادہ رہے گا۔

سرجے گارسٹ نے اسکاٹ لینڈ کے سالیسٹر جنرل سے جو تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے گورنمنٹ کی جانب سے نمائندگی کرنے کے لئے مقرر ہوئے تھے ملاقات کرائی اور نواب صاحب کو عام اجازت دی گئی کہ جس وقت ان کو ضرورت ہو انڈیا آفس میں آئیں اور جس معاملہ میں ضرورت ہو سر بریڈ فورڈ سے خط و کتابت کریں۔

پالیسی کے اظہار کا نتیجہ

عبدالحق اور اجارہ داروں اور اُن کے ہمدردوں نے اس مقصد سے غلط فہمیاں پھیلانی شروع کی تھیں کہ گورنمنٹ نظام کی اس منصفانہ اور بے لاگ کارروائی پر بُرا اثر پڑے لیکن نواب صاحب کی ملاقاتوں، گفتگوؤں اور اپنی پالیسی کے صاف صاف اظہار سے مخالفین کا مقصد حاصل نہ ہو سکا اور وہ سب غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور گورنمنٹِ نظام کو ہر طرف سے امداد حاصل ہوئی۔

ایک سخت پیچیدگی

عبدالحق کے پاس سر سالار جنگ اوّل اور عماد السلطنت کی کچھ اس قسم کی تحریریں بھی تھیں کہ جن کو ان معاملات پر موثر کہا جاتا تھا اور اُن سے نہ صرف مقدمہ پیچیدہ ہو گیا تھا بلکہ اُن کی نیک نامی پر بھی بُرا اثر پڑ رہا تھا اور صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ سر سالار جنگ اوّل نے عبدالحق کو ریلوے اور مائننگ کے معاملات میں حق المحنت حاصل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

نیز بہت سے غلط خیالات موجودہ وزیر سر آسمان جاہ کے متعلق بھی پھیلائے گئے تھے اور سردار عبدالحق نے ایک طلسم قائم کر رکھا تھا۔ بڑے بڑے اعلیٰ مرتبت اشخاص ان کے طرفدار تھے اور اس کارروائی کو راست بازی کے خلاف سمجھتے تھے۔ نواب صاحب کے لئے یہ حالات سخت سوہانِ روح تھے۔ سر سالار جنگ اوّل و ثانی کی کارروائیوں کے متعلق خیالات کی صفائی کرنا اپنی گورنمنٹ کی نیک نیتی اور راست بازی کا یقین دلانا نہایت بیدار مغزی اور تدبر و فراست کا کام تھا اور اُنھوں نے اس کام کو بہ احسن الوجوہ انجام دیا۔ نواب صاحب نے ان واقعات کو جستہ جستہ بعض خطوط میں بھی لکھا ہے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

"جناب لارڈ لارنس[1] صاحب آئے اور اس قدر غصہ میں کہ اُن کا سارا بدن غصہ سے کانپ رہا تھا کہنے لگے کہ "میرے ساتھ سرکار نظام نے ایسا برتاؤ کیا ہے اور اس معاملہ میں وہ ایسی کارروائی کر رہے ہیں کہ میں ابھی جا کر لارڈ کراس سے کہتا ہوں"

قریب تھا کہ رگِ ہاشمی جوش کرے اور بارہہ کے سید کو بھی غصہ آجائے اور خوب گھونسہ چلے مگر صبر کیا اور ان کو سمجھایا پھر تو وہ نہایت ہی شرمندہ ہوئے اور اپنے دوست کو گالیاں دینے لگے اور کہا کہ درحقیقت وہ نہایت ہی جھوٹا ہے ۔ کاڈری صاحب تشریف لائے تھے اُن کو اس قدر غصہ عبدالحق پر تھا کہ اس کا بیان نہیں ہوسکتا اور اپنی کارروائی پر اتنا رنج کرتے تھے کہ آخر رونے لگے اور آنسو جاری ہوگئے ۔ میں نے نواب صاحب کی طرف سے بہت کچھ تشفّی کی اور کہا کہ سرکار کو آپ کی نسبت کوئی دوسرا خیال نہیں ہے اور وہ آپ کو نہایت ہی متدیّن اور پاک سمجھتے ہیں ۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور کئی دفعہ شکر گزاری کے الفاظ زبان پر لائے "

ہاں یہ تو بھول ہی گیا کہ جناب لیوشیر[2] دام اقبالہم سے بھی ملا ۔ مولانا کیا کہوں وہ تو عجیب آفت کا پتلا ہے ایسا آدمی تو نہ دیکھا نہ سنا ۔ وہ آدمی کا ہے کو ہے بلائے روزگار ہے اس پر حضرت سنجیدہ بھی ہیں اور کوئی بات آپ کی ظرافت سے خالی نہیں اور گو کہ آپ کمیٹی کے ممبر ہیں مگر اپنے گھر پر اس مقدمہ کی ایسی کارروائی کرتے ہیں کہ گویا وہ وکیل ہیں نہ کسی سے پردہ نہ چوری ۔ لوگوں کو بُلانا ان سے بات کرنا مقدمہ کے حالات دریافت کرنا ۔ سب کچھ ہوتا رہتا ہے ۔ میں نے مہدی حسن سے کہا کہ دیکھئے یہ جج ہیں ۔ مہدی حسن نے کہا کہ لندن کے جج ایسے ہی ہوا کرتے ہیں"

---

[1] کمپنی کے جلیل القدر ڈائرکٹر تھے ۔

[2] پارلیمنٹری کمیٹی میں ممبر مقرر کئے گئے تھے ۔

کمیٹی کے سامنے شہادت

نواب صاحب کو کمیٹی کے سامنے بہ حیثیت گواہ طلب کیا گیا لیکن سرکار عالی کی عزت و وقعت کے لحاظ سے ان کو حلف نہیں دیا گیا۔ نواب صاحب کی شہادت صرف پیشی دستاویزات اور اُن کے متعلق اظہار واقعات تک محدود تھی۔ بیان نہایت صداقت و احتیاط کے ساتھ دیا گیا تھا۔ نواب صاحب نے اپنی ذکاوت و ذہانت سے اس طرح مختصر مگر صاف جوابات دئے تھے کہ کمپنی اور عبدالحق اور سالیسٹر جنرل وغیرہ کو جرح کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اُنھوں نے سر جے گارسٹ سے ملاقات میں صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ میری شہادت پیشی دستاویز تک محدود ہوگی البتہ اگر کوئی ایسا سوال ہوگا جس کا مجھ کو ذاتی علم ہو، تو اس کا جواب دوں گا۔ نواب صاحب کے بیان کو کمیٹی نے بہت پسند کیا اور سر حرڈ ٹمپل نے جو اس کمیٹی کے ممبر تھے بہت تعریف کی۔

کیمبرج کانووکیشن کی شرکت

کیمبرج میں ۹ رجون کو کانووکیشن کی تقریب تھی جس میں پرنس البرٹ وکٹر (فرزند شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم) لارڈ سالسبری لارڈ روزبری اور دیگر ممتاز لوگوں کو ڈگریاں ملیں۔ پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہفتم) بھی یونیورسٹی کے گون میں تھے۔ اس دلچسپ تقریب کے بعد ایک زنانہ کالج کی افتتاحی رسم میں شریک ہوئے جس کو پرنس آف ویلز کے ہاتھوں سے ادا کرایا تھا۔ یہاں نواب صاحب اور اُن کے رفیق نواب فتح نواز جنگ کی موجودگی پر نہایت جوش کے خوشی کے نعرے لگائے گئے۔

انڈین سوسائٹی کا ایڈریس

شام کو ہندوستانی طلبار کو ایسوسی ایشن نے ایک ایڈریس پیش کیا اور نواب صاحب نے اس کے جواب میں دلچسپ تقریر کی۔

طلبار کو دعوت

ماہ جون کے آخر میں نواب صاحب نے نارتھ بروک کلب میں ہندوستانی طلبار کو مدعو کیا جو قریباً چالیس تھے۔ بہت دلچسپ باتیں رہیں اور ٹفن کے بعد طلبار کے ساتھ تصویر لی گئی۔

ایک دعوت میں تقریر

جولائی میں مسٹر کنگ ممبر پارلیمنٹ نے کنسر وٹیو کلب میں

جو سر سیل گریفن[1] کے اعزاز میں تھی اور جس میں چند ممبران پارلیمنٹ اور جلیل القدر اصحاب مثل سر جان گورس، سر رچرڈ ٹمپل وغیرہ کے شامل تھے نواب صاحب بھی مدعو تھے۔ شاہی جام ہائے صحت کے بعد مسٹر کنگ نے سر لیپل گریفن کا جام صحت تجویز کیا۔ اثنائے تقریر میں سر لیپل گریفن کے حیدرآباد مقرر ہو کر جانے کا تذکرہ کرنے نواب صاحب اور نواب فتحنواز جنگ کی موجودگی پر مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کو آئندہ ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے گا۔

میزبان نے تقریر کے بعد ان کے ہندوستانی مہمانوں سے درخواست کی کہ وہ بھی ہندوستان کی حالت کی نسبت عموماً اور حیدرآباد کی نسبت خصوصاً کچھ بیان کریں۔ نواب صاحب نے میزبان کی فرمایش پر ایک دلچسپ تقریر کی۔ اثنائے تقریر میں نواب صاحب نے اس پر بڑا زور دیا کہ حضور پرنور نے سرکار انگریزی کا کیسا ساتھ دیا اور حضور پرنور سرکار ملکہ معظمہ کے بڑے پرانے آزمودہ کار دوست ہیں۔ سرکار انگریزی اور سرکار عالی بطور مقراض کے دو پھلوں کے ہیں جن کی نسبت یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ کون کس کی زیادہ مدد کرتا ہے۔"

مختلف مقامات کی سیر و تفریح دعوتیں اور ملاقاتیں

نواب صاحب نے لندن کے تقریباً تمام قابل دید مقامات کی سیر کی۔ اسی سلسلہ میں بحری فوج کا دفتر بھی دیکھا۔ امیر البحر نے نہایت تپاک سے خوش آمدید کہا۔ بحری مدرسہ کا معائنہ کیا جو تین پرانے جہازوں کو منسلک کر کے بنایا گیا تھا۔ تارپیڈو اور برقی قوت کے کرشمے بھی دیکھے۔

ایک اور قابل ذکر دعوت میں بھی شریک ہوئے جو لارڈ ناتھ بروک سابق وسیرائے ہند نے لارڈ لینسڈون کو دی تھی جب کہ وہ ہندوستان میں وسیرائے ہو کر آرہے تھے اس موقع پر ہندوستانیوں کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا تھا۔ وسیرائے نے ایڈریس کے جواب میں جو تقریر کی تھی اس میں ریاستوں کے باشندوں اور حکام کے تذکرہ میں نواب صاحب اور نواب فتح نواز جنگ کی موجودگی پر اس طرح اپنی مسرت کا اظہار کیا کہ:۔

"مجھ کو اس مسرت دلی کے ظاہر کرنے کی بھی اجازت دیجیے کہ جو مجھ کو یہاں ان دو ناموَ

---

[1] سنٹرل انڈیا ریذیڈنسی واندور کے مشہور ریذیڈنٹ۔

مدبّروں کے دیکھنے سے ہوئی ہے جو سرکار عالی نظام کے عہدوں پر ممتاز ہیں"۔

اسی طرح بہت سی ممتاز دعوتوں میں شریک ہوئے اور ممتاز و جلیل القدر مشاہیر اور خاص کر ہندوستان کے سابق اعلیٰ حکام سے پُرلطف ملاقاتیں ہوئیں۔

مسٹر گلیڈسٹون سے ملاقات

ان مشاہیر میں مسٹر گلیڈسٹون کی ملاقات اور ان سے مختلف ملکی مسائل پر اور خصوصیت کے ساتھ نیشنل کانگریس اور ترکی کے متعلق اُن کی جو پالیسی تھی اُس پر گفتگو ہوئی۔ اُن پر نواب صاحب کی بیدار مغزی کا خاص اثر ہوا اور نہایت احترام کا برتاؤ کیا۔ اس ملاقات کے حالات تمام اخبارات میں شایع ہوئے اور لندن ٹائمز نے ایک لیڈنگ آرٹیکل بھی لکھا۔

لندن ٹائمز کے اڈیٹر سے ملاقات

انگلستان بلکہ برٹش ایمپائر میں لندن ٹائمز ایک خاص طاقت کا اخبار ہے۔ نواب صاحب نے اِس کا دفتر بھی دیکھا اور اڈیٹر سے بھی ملاقات کی۔

لارڈ رپن کے یہاں دعوت

لارڈ رپن نے جن کو نواب صاحب کی قابلیتوں کا ذاتی تجربہ تھا اور جن کو ۱۸۸۴ء میں معاملات حیدرآباد کے متعلق نواب صاحب کے مرتّبہ کاغذات سے امداد ملی تھی لندن سے باہر اپنے مکان پر مدعو کیا اور نہایت تپاک اور احترام کے ساتھ ملاقات کی۔

نواب صاحب کے مہمان

اکثر ممتاز اور ذی وقعت اصحاب مثل سرجان گاسٹ (نائب وزیر ہند) سرالفریڈ لائل، سرجان اسٹرچی، لارڈ لارنس وغیرہ خود بھی نواب صاحب کے پاس آتے رہتے تھے اور اُن کی میزبانی اور خاطر مدارات سے لطف اُٹھاتے تھے اور خاص کر وہ لوگ جن سے معدنیات کا تعلق تھا زیادہ آتے جاتے تھے اور آزادی کے ساتھ گفتگو ہوتی تھی۔

ادائے فرائض کی تعریف

نواب صاحب نے لندن میں اپنے فرائض کی ادائگی میں اپنے فرائض کو ایسی عمدگی، بیدار مغزی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیا تھا جس کی ہر طرف سے تعریف کی گئی۔ حیدرآباد میں بھی اُن کی کارروائیاں بہت پسند کی گئیں اور گورنمنٹ آف انڈیا نے

بھی پسند کیا۔

سر مارٹیمر ڈیورنیڈ کی تحسین

چنانچہ سر مارٹیمر ڈیورنیڈ نے ۲۵ - نومبر ۱۸۸۸ء کی ایک چٹھی میں لکھا کہ:-

"ہر شخص کو اس سے اتفاق ہے کہ آپ نے انگلستان میں اپنا کام نہایت قابل تعریف دوراندیشی اور دانش مندی کے ساتھ انجام دیا ہے اور جو کچھ اعتماد آپ پر کیا تھا آپ نے پوری طرح اس کو نباہا"

مراجعت

نواب صاحب کی طبیعت چوں کہ علیل ہوگئی تھی اس لئے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے چند دن برٹن میں بھی قیام کیا مگر پھر بھی صحت نہ ہوئی تو مجبوراً ابتدائی کارروائیوں کے ختم ہونے کے بعد اکتوبر میں واپس آگئے۔ ویانا، برلن اور قسطنطنیہ جانے کا بھی ارادہ تھا مگر صحت کی خرابی کے باعث ملتوی رہا۔

انگلستان کے تاثرات

نواب صاحب کو جہاں تک موقع حاصل ہوا لندن کے مختلف النوع انسٹی ٹیوشنوں اور مجالس کو دیکھا اور ہر ایک حالت پر متجسس نظروں سے غور کیا جس طرح وہاں کی شاہی شان و شوکت اور قومی عظمت و جلال کا معائنہ کیا، اسی طرح وہاں کی تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی حالت کو بھی توجہ سے دیکھا۔

ایک انٹرویو

واپسی کے بعد ساحل ہند پر قدم رکھتے ہی ایک جنٹلمین نے انٹرویو کر کے انگلستان کے متعلق چند سوالات کئے ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ "انگلینڈ میں کونسی چیز سے آپ کو بہت زیادہ دلچسپی ہوئی" تو نواب صاحب نے کہا کہ:-

"میں خیال کرتا ہوں کہ انگلینڈ میں دلچسپ چیزیں وہی ہیں جن پر ہم مسلمان بہت کم غور کرتے ہیں یہاں کی سوسائٹی کو دیکھ کر اور جس طریقہ سے باہمی اختلاط خانگی زندگی اور قوم کی تعلیم پر اثر ڈالتا ہے وہ میں دیکھ کر نہایت متاثر ہوا۔ انگریزی خواتین نہ صرف کتابوں میں بلکہ دنیا کے کاروبار میں مردوں کے برابر تعلیم یافتہ ہیں اور ہر علم وہ اپنے بچوں کو سکھاتی ہیں بچوں کی تعلیم اور قوم کی بہبودی پر اس کا اثر قیاس سے باہر ہے۔ مگر مسلمانوں میں اس

کی بڑی کمی ہے۔"

نامہ نگار نے اس موقع پر سوال کیا کہ :۔

"پھر بھی آپ اپنے رسول مقبول کے قانون[1] کو مانتے ہیں۔"

نواب صاحب نے فرمایا کہ :۔

"نہیں وہ کوئی قانون نہیں ہے مگر بہت لوگ ویسا ہی خیال کرتے ہیں وہ محض ایک رسم ہے۔"

حیدرآباد کلب میں تقریر

اس کے بعد جب حیدرآباد پہونچے تو حیدرآباد کلب میں ان کی دعوت ہوئی اگرچہ طبیعت مضمحل تھی اور تکانِ سفر غالب تھا تاہم انھوں نے ایک مختصر تقریر میں جو بجواب تجویز جامِ صحت کی تھی ان تمام تاثرات اور اس زمانہ کی بے چینی اور انقلابی دقتوں کو جو برّ اعظم یورپ میں پائی جاتی ہیں بیان کیا۔ اسی سلسلہ میں لندن کے افلاس کے متعلق کہا کہ :۔

"وہاں مفلسی سخت ہے۔ تکلیف شدید ہے اور ایک حصّہ لندن میں ایسے مصیبت زدہ لوگ ہیں جو تمام دکن میں بلکہ یقیناً تمام ہندوستان میں نہ ملیں گے۔"

بداخلاقی پر نفرت کا اظہار

وہاں کی اس بداخلاقی کے متعلق جس کو ہر راسخ الخیال مسلمان مذہبی نقطۂ نظر سے نہایت ذلت و حقارت سے دیکھے گا اگرچہ انھوں نے کسی انٹرویو یا تقریر میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی لیکن پھر بھی سر سیپل گریفن کے جواب میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس سے اس کے اثر کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے اس کے علاوہ اپنے ایک پرائیویٹ خط میں نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں کہ :۔

"ایسا بے غیرت، بے حمیت، ناپاک ملک دنیا میں نہ ہوگا۔ ایمان، غیرت اور انصاف کا نام نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ بابل یا پامپائی کی طرح کب غارت ہوگا۔

---

[1] موجودہ پردہ کی طرف اشارہ ہے۔

سرسیل گریفن سے ایک مقابلہ

سرسیل گریفن[1] ایک مشہور رزیڈنٹ تھے اور وہ ان برطانوی پولٹیکل افسروں میں سے ہیں جو اپنے زور قابلیت سے گورنمنٹ آف انڈیا اور انڈیا آفس میں ہر اُس بات کو منوا لیتے تھے جس کو وہ خواہ از روئے انصاف صحیح سمجھتے ہوں یا اُن کی بنیاد محض تعصب یا ضد پر ہو۔

سرسیل گریفن کا ایک لکچر

اُنھوں نے جون ۱۸۸۹ء میں ہندوستانی ریاستوں اور ہندوستانی فرماں رواؤں کے متعلق لندن کے کالونیل انسٹی ٹیوٹ میں ایک معرکۃ آلارا لیکچر دیا تھا جس میں ریاستوں کی بدانتظامی دکھا کر والیان ریاست پر سخت حملہ کیا گیا تھا اور اس حملہ کی سختی خصوصیت کے ساتھ مسلمان ریاستوں اور رئیسوں پر زیادہ تھی۔

نواب صاحب کا مدافعانہ جواب

نواب صاحب نے اس کا جواب انگلستان کے مقتدر رسالہ ناینٹینتھ سنچری میں شائع کرایا اگرچہ یہ جواب حیدرآباد کی مدافعت تک محدود تھا جس میں ہر اعتراض کی واقعات اور بعض مقتدر انگریز عہدہ داروں کی رایوں سے تردید کی تھی اور ریاست کے صیغہ میں چہل سالہ اصلاحات و ترقیات کا اعداد و شمار سے ثبوت دیا تھا لیکن ضمناً تمام ریاستوں کی مدافعت تھی۔ اس جواب نے سرسیل گریفن کے اعتراضات اس طرح بہا دیئے جس طرح زور و شور کی بارش خس و خاشاک کو بہا لے جاتی ہے

سرسیل گریفن نے اپنے لکچر میں اس طریقہ سے جو اُن ہی جیسے آدمی کی طبیعت کا مقتضا ہے حیدرآباد، بھوپال اور بھاول پور کا نام لے کر اور رئیسوں کی وفاداری پر اعتماد ظاہر کر کے عام مسلمانوں پر یوں حملہ کیا تھا کہ :-

"مگر اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ مسلمانوں کی خلقی ذکاوت کے باعث اور اسلام

---

[1] ۱۸۸۵ء میں جب کہ وہ سنٹرل انڈیا میں رزیڈنٹ تھے تو اُنھوں نے ریاست بھوپال کو جس کی وفاداری سلطنت برطانیہ کے ساتھ بے نظیر اور ضرب المثل ہے۔ محض نواب صدیق حسن خاں شوہر رئیسہ (خلد مکان نواب شاہجہاں بیگم) کی بعض مذہبی تصانیف کی بنا پر تقریباً بغاوت کا منبع ثابت کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی تھی اور اس وجہ سے جو واقعات اس زمانہ میں رونما ہوئے اُن کے باعث سرسیل گریفن کو خاص شہرت حاصل ہو گئی تھی۔

کی زندہ قوت کے سبب اور دنیا کے مختلف حصوں میں اُن کی حکومت ہونے کی وجہ سے اب تک بہ نسبت دوسرے مقامات کے مسلمانی ریاستوں اور شہروں میں زیادہ تر جوش اور پولیٹیکل سازشوں کا وجود موجود ہے تاہم اس سے کسی دلیر اور دانش مند گورنمنٹ کو کوئی خوف نہ رکھنا چاہیے جو مفسدوں اور سرکشوں کو پہچان سکتی ہے اور اُن کو سزا دینے سے بالکل نہیں ڈرتی۔ ہندوستان میں انگریزی عملداری کے استقلال کے لئے خطرہ ہی تو صرف مفسدوں کی سرکوبی میں بے وقوفانہ بزدلی ظاہر کرنے سے ہے۔"

نواب صاحب نے اپنی متعارف اور مسلّمہ قابلیت اور دل نشین و دل چسپ دلائل کے ساتھ یہ بات دکھائی "کہ کوئی ہندو مسلمان نہ تو سلطنت کا بدخواہ ہے نہ اس کی جگہہ کسی دوسری سلطنت کا قیام پسند کرتا ہے۔ کوئی ایک بھی ریاست نہیں ہے جو ہندوستان کی سلطنت کا دعوےٰ کرے اور اس کے دعوے کو دوسری ریاستیں تسلیم کریں۔

مسلمانوں کے بدخواہ نہ ہونے کی قوی دلیل مذہب ہی کی زندہ قوت ہے اور ہمارے روزانہ افعال کا انتظام اس کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ انگریزی حکومت کے سایہ میں مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ سلوک ہوا ہے اور مذہبی فرائض و رسوم کے ادا کرنے میں وہ کامل آزاد رہے ہیں اس لئے انگریزی سلطنت کے خلاف جہاد کرنے کے خیالات کو ہر ایک سمجھ دار مسلمان فوراً بُرا کہے گا اور بُرا کہتا ہے۔"

پھر اُنھوں نے حیدرآباد کی خدمات و وفاداری کو بیان کرنے کے بعد سر لیپل گریفن کے اس فقرہ کے جواب میں کہ:۔

"مفسدوں کی سرکوبی میں بے وقوفانہ بُزدلی ظاہر کرنے سے انگریزی حکومت کے استقلال کو خطرہ ہے۔"

اس فقرہ کا جواب دے کر جس میں اراکین کانگریس کو الزامات سے بری قرار دیا ہے لکھتے ہیں:۔

"مجھے یقین ہے کہ سرلیپل گریفن نے ایسی ریاستوں پر بالعموم اور حیدرآباد پر بالخصوص یہ جو دو بڑے الزام لگائے ہیں اُن کا جواب میں نے کسی قدر کامیابی کے ساتھ دے دیا لیکن سرلیپل گریفن نے دیسی ریاستوں کی بدانتظامی کے دو وجوہ اور بھی بیان کئے ہیں۔ ایک وجہ کا تعلق بالعموم دیسی ریاستوں سے ہے اور اس لئے حیدرآباد سے بھی ہے۔ حیدرآباد کے ذکر میں سرلیپل گریفن نے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے:

"حیدرآباد کی فنانشل دغابازیوں نے بالفعل اس ملک میں عام شہرت حاصل کی ہے اس ریاست کی تمام مشکلوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے عہدناموں کی رو سے دوسرے مقامات کی طرح وہاں یورپین کے تقرر کی ممانعت نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس ملک میں بُرے نمونے کے یورپین قسمت آزمانے والے جمع ہو گئے ہیں جن کی سازشوں کی روک تھام مشکل ہے اور جن کو سوائے اس کے کوئی خیال نہیں رہتا کہ نظام اور اُن کے مدارالمہاموں سے روپیہ ٹھگیں۔"

میں نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ سرلیپل گریفن نے ایسی بے بنیاد بات کیوں کہی۔ برٹش گورنمنٹ کے ساتھ ہمارے عہدنامے درحقیقت اس قدر سخت ہیں اور اُن کی شرائط پر ایسی پوری نگرانی رکھی جاتی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی اجازت پہلے سے حاصل کئے بغیر سرکار یا کوئی اور کسی یورپین کو بھی اپنی خدمت میں رکھ نہیں سکتا۔ اگر اس طرح پر کوئی شخص مامور بھی کیا جائے تو گورنمنٹ کی منظوری حاصل کئے بغیر اس کی تنخواہ مقررہ میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا یہ بات قابل مضحکہ کے ہے کہ ایسے لوگوں کا ایک گروہ قسمت آزماؤں کے لقب سے نامزد کیا جائے جن میں بہت سے ایسے اشخاص ہیں جو اپنی قابلیت اور عمدہ چال چلن کے لئے خاص طور پر منتخب کئے گئے۔ سرلیپل گریفن کے بلاتمیز الزاموں نے اُن یورپین عہدہ داروں کے دلوں کو بہت بڑا رنج پہونچایا ہے جو یہاں مختلف خدمات پر مامور ہیں۔"

اسی سلسلہ میں ... یورپین عہدہ داروں کے سوشیل تعلقات کا جو برٹش انڈیا میں

نہیں پائے جاتے تذکرہ کرکے لکھتے ہیں کہ :-

"سر سیل گریفن دکن کے معدنی معاملات کی نظیر دے کر بیان کرتے ہیں کہ "اس مقدمہ کو غور سے دیکھنے سے ہر غور کرنے والے شخص کو مالی کارروائی کی مشرقی اور مغربی طریقوں کی حقیقت معلوم ہو جائے گی مگر اس سے پوست کندہ حال معلوم نہ ہو سکے گا اور نہ دیسی ریاستوں کے عہدہ داروں کی معمولی دغابازی کا خیال ہو سکے گا جہاں ایمان داری تک کا نام نہیں ہے"

سر سیل گریفن خیال کرتے ہیں کہ دکن کی معدنیات کا یہ بدنام معاملہ ایک خاص طور کے بُرے قسمت آزماؤں کے سبب سے پیدا ہوا جس سے سر سیل گریفن کے قول کے بموجب حیدرآباد بھرا ہوا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اجارہ کے دینے میں یا کمپنی کے قائم کرنے میں کمپنی کے قائم کرنے والوں کے سوائے ہندوستان کے کسی یورپین کی خواہ وہ قسمت آزمایا اور کوئی شخص ہو کوئی مداخلت نہ تھی تمام خط وکتابت رزیڈنٹ کے ذریعہ سے ہوتی تھی اس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکال لیا اور کمپنی لندن میں ان شرائط پر قائم ہوئی جن کو سرکار ہند نے منظور کیا تھا بہ استثنار ایک شخص کے کسی حیدرآبادی عہدہ دار کو اس عظیم لوٹ میں کوئی حصّہ نہیں ملا تھا جس کو اجارہ داروں نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا اس بدنصیب کمپنی کے حصّہ داروں نے جو نقصان اُٹھایا اور دھوکا کھایا اس کے لئے اُن کو حیدرآبادی قسمت آزماؤں یا دغابازوں کا نہیں بلکہ لندن کے دغابازوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ خاص اجارہ کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدرآباد کے عہدہ داروں پر اس کی نسبت کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ ہم کو معلوم تھا کہ یہاں بیش بہا کوئلوں کی کانیں اور دوسری معدنی اشیار اور قدیم سونے اور ہیرے کے معدن موجود ہیں۔ ہم نے جب اپنے معدنی حقوق کا اجارہ دیا تو محض نیک نیتی سے دیا تھا اور

ہمارا منشا تھا کہ ملکی معدنیات میں ترقی دی جائے۔ ہم البتہ یہ شکایت کر سکتے ہیں کہ اسٹاک ایکسچینج کی کارروائی سے (جس سے ہم قدرتی طور پر لاعلم ہیں) دوسروں نے فائدہ اُٹھایا مگر انصافاً یہ الزام ہم پر نہیں لگایا جا سکتا کہ ہم نے پبلک کو دھوکہ دیا۔ درحقیقت حصّہ داروں سے بھی زیادہ ہمارا نقصان ہوا ہے کیوں کہ ہم نے اپنی بیش بہا ملکیت بلا کسی معاوضہ کے ایک ایسی کمپنی کو دے دی ہے جس کے پاس اس کی ترقی کے لئے سرمایہ نہیں ہے اب میں اس دوسری بات سے بحث کرنا چاہتا ہوں جس کو سر لیپل گریفن نے دیسی ریاستوں کی عام بدانتظامی کا سبب بیان کیا ہے یعنی رُوسا کی بے پروائی اور ملکی معاملات میں اُن کی غفلت، عیّاشی اور نفس پرستی وہ ہندوستانی رئیسوں کی تصویر اس طور پر کھینچتے ہیں کہ:-

"نوجوان رئیس کے کانوں میں جو چاروں طرف سے ستار بجانے والے مصاحبوں اور کنچنیوں سے گھرا رہتا ہے فرض منصبی کی صدا نہیں پہونچتی ہے کیوں کہ اس کی طبیعت عورتوں کی چوڑیوں کی جھنکار اور طنبورہ کی صدا سُن کر عشق و شراب کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔"

یہ تصویر گو مصوّر کی تصویر کشی کے فن میں اُستاد ہونے کی وجہ سے کیسی ہی دل پر اثر کرنے والی ہو لیکن جہاں تک حیدرآباد اور یہاں کے رئیس سے تعلق ہے بُرے بُرے خط و خال دکھاتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ حیدرآباد کے مدارالمہام کی حالت دوسری ریاستوں کے دیوانوں سے بالکل جُدا گانہ ہے جہاں تک انتظام سے تعلّق ہے مدارالمہام کو پورا اختیار ہے۔ وہ کام کے تفصیلی معاملات کے خود ذمہ دار ہیں اور صرف حضرت اقدس و اعلیٰ کی بارگاہ میں جواب دہ سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں تک کہ حضرت کی ذات سے تعلق ہے اگرچہ انتظام کے تفصیلی کاموں کو حضرت خود انجام نہیں فرماتے لیکن معاملات ریاست کے ساتھ خاص قسم کی دلچسپی ہے یہاں تک کہ کوئی ایسا حکم جس سے رعایا کے حقوق

کا تعلق ہو بغیر منظوری اعلیٰ حضرت کے جاری نہیں ہو سکتا۔ مدار المہام کے لئے ہفتہ میں تین مرتبہ اعلیٰ حضرت کے حضور میں حاضر ہونا لازم ہے تاکہ معاملات ریاست سے اطلاع دیتے رہیں اور ان موقعوں پر حضرت اقدس و اعلیٰ تمام کارروائیوں میں نہایت دلچسپی کا اظہار فرماتے ہیں اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ عیش و عشرت اُن کے فرض منصبی میں مداخلت کرتا ہے بخلاف اس کے انتظامی امور میں نہایت متوجہ ہیں اور تمام کاغذات جو پیش ہوتے ہیں اُن پر حکم صادر کرنے سے پہلے احتیاط کے ساتھ غور فرماتے ہیں۔ کام کی طرف حضرت کی توجہ کی مثالیں پیش کرنا میرا کام نہیں۔ چھوٹا مُنہ بڑی بات لیکن میں اس وجہ کے نتائج بتا سکتا ہوں بے شک آئندہ موسم سرما میں ہمارے انگریز دوست ہمیں اپنی ملاقات سے عزت بخشیں گے۔ اور اس عرصہ میں اگر ان میں سے کوئی میری کچہری کی طرف تشریف لاویں گے تو میں اُن کو ایسی جلدیں کی جلدیں بتادوں گا جن میں ہمارے خداوند نعمت کے دست مبارک کے لکھے ہوئے احکام کے سوا اور کچھ نہیں۔ غالباً یورپین ناظرین کو نہیں معلوم ہے کہ حضرت کی خانگی آمدنی کا بہت بڑا حصہ تعلقات صرف خاص سے وصول ہوتا ہے یہ تعلقات اس ریاست کے مختلف اضلاع میں واقع ہیں اور صرف خاص کی جملہ آمدنی تخمیناً پانچ لاکھ پونڈ ہے۔ ان تعلقات کے معاملات کا تصفیہ حضرت اقدس اعلیٰ کے حکم اور نگرانی سے ہوتا ہے پس خیال میں آسکتا ہے کہ اس کام میں بڑا حصہ حضرت کے وقت کا صرف ہوتا ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ گریفن صاحب نے عموماً رئیسوں کو عیش پرست کیوں کر کہا اگر ان کو معلوم ہوتا کہ ہمارے رئیس کیسے مردانہ اشغال میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی جفاکشی اور محنت کی کیا حالت ہے تو ایسا الزام عام نہ لگاتے اسی سال کا یہ حال ہے کہ گرمیوں کے دنوں میں جب کہ بڑے بڑے درجہ کے حضرات یورپین ہمالیہ اور نیلگری کے پہاڑوں پر گرمی سے بچنے کے لئے تشریف رکھتے ہیں اور آفتاب کی حرارت سے وہاں کی سردی میں

پناہ لیتے ہیں ہمارا بہادر جوان مرد رئیس اپنے ملک کے دورے میں مصروف تھا اور اس سے نہ صرف شکار یا تفریح طبع منظور تھی بلکہ خاص غرض یہ تھی کہ کوئلوں کی کانوں کا ملاحظہ فرماویں اور جو دولت و خزانہ اس سرزمین نے چُھپا رکھے ہیں اُسے دیکھیں کیا جو شخص عیش و عشرت کا بندہ ہے اُس سے ایسے مردانہ کام ہو سکتے ہیں یا وہ ایسی محنت و تکلیف گوارا کر سکتا ہے - یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ہمارے حضرت کو شکار کا از حد شوق ہے یہی ایک بات اس کی دلیل ہے کہ ہمارے حضرت بندگان عالی نہایت محنتی، چُست، تیز اور مستعد نوجوان ہیں - جن یورپین سپاہیوں نے حضور کو شرطوں کے زمانہ میں خود جوکڑا ہانکتے ہوئے دیکھا ہے یا جنہوں نے عالیجناب ڈیوک آف کناٹ کی تشریف آوری کے وقت نیزہ بازی کے کھیل میں حضرت کی چُستی اور مستعدی کو ملاحظہ فرمایا ہے مجھے یقین ہے کہ وہ ہرگز یہ کہیں گے کہ جو تصویر سر لیپل گریفن نے کھینچی ہے وہ ہمارے حضرت خداوند نعمت پر صادق آتی ہے - یہ کون کہتا ہے کہ ہندوستانی رئیسوں اور امیروں کو کسبیوں کے ناچ سے پرہیز ہے اور کیوں ہو یہ اس ملک کا قدیمی رواج ہے اسلئے اگر کوئی رئیس ناچ نہ دیکھے تو اس پر تعجب کیا جا سکتا ہے مگر کیا ہمارے یورپین دوست شاہزادوں سے لے کر عوام الناس تک ایسی دل خوش کُن باتوں میں ہمارے شریک نہیں ہیں اور کیا وہ ایسی چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو لندن الحمرا اور پیرس کے تھیٹروں میں جو اندر کا اکھاڑہ نظر آتا ہے اور جہاں پری پیکر نازنینوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ پردہ اُٹھتے ہی اُچھلتے کودتے ناچتے گاتے باہر نکل آتے ہیں اور اپنے دل فریب غمزوں اور توبہ شکن اداؤں سے دیکھنے والوں کا دین اور دل غارت کرتے ہیں اُن کے تماشے اور ناچ گانے کے مقابلہ میں تو گویا ہم کچھ کرتے ہی نہیں جس نے ان ایمان کے برباد کرنے والے تماشوں کو لندن اور پیرس میں دیکھا ہوگا وہ سمجھ سکتا ہے کہ بربط کی آواز اور چوڑیوں کی جھنکار کچھ

ایشیائی لوگوں پر ہی اپنا اثر نہیں ڈالتی بلکہ یہ کمبخت آواز مغرب میں حضرات یورپین کے دل ہیں اور دماغ پر اپنی پوری پوری تاثیر کرتی ہے میں انکار نہیں کر سکتا کہ ایسے ہندوستانی رئیس ہیں جو اپنے فرائض میں غفلت کرتے اور جو ناچ اور رنگ میں ڈوبے ہوئے رہتے ہیں مگر کیا مغربی قوموں نے ناچ اور رنگ اور دیگر اقسام عیش و عشرت میں عموماً پورے طور پر ہمیشہ اعتدال رکھا ہے اور فرائض کو تفریح پر ہمیشہ مقدم جانا ہے میں تو نہیں سمجھ سکتا کہ اس کا کوئی عام دعویٰ کر سکے۔ سر لیپل گریفن نے اخلاق کی نسبت جو وعظ فرمایا ہے اس کی ضرورت اور وقعت کتنی ہی کیوں نہ ہو مگر اُس رئیس کی نسبت جس کی نوکری کا شرف مجھے حاصل ہے وہ وعظ بالکل ناواجب اور صدائے بے ہنگام ہے میں نہایت دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ بہت کم رئیس ایسے ہوں گے جنہوں نے سلطنت کی ذمہ داریوں اور ریاست کے فرائض کو ہمارے حضور پُر نور سے بڑھ کر سمجھا ہو اور اپنے عہد دولت میں عیش و عشرت کے کاموں میں دخل دینے دیا ہو درحقیقت کوئی شخص جو پچھلے چند سال کی تاریخ اس ریاست کی لکھے اس کی کتاب ناقص و ناتمام سمجھی جائے گی اگر اس بیدار مغزی بلکہ نفس کشی کا ذکر فخر و مباہات کے ساتھ نہ کیا جائے جو کہ ہمارے حضرت اپنے اعلیٰ درجہ کے فرائض ادا کرنے میں ہمیشہ نہایت خوشی کے ساتھ دکھلا رہے ہیں۔" ۱۲ اگست ۱۸۸۹ء

نواب فتح نواز جنگ سے مخالفت

جب نواب فتح نواز جنگ واپس آئے تو اُن میں اور نواب محسن الملک میں جو خفیف رنجش پیدا ہو گئی تھی وہ بالآخر دشمنی تک پہنچ گئی۔ مقدمہ و معاملہ معدنیات کی رپورٹوں، تجویزوں اور کارروائیوں کے متعلق اختلافات شروع ہوئے اور ان اختلافات میں ہندوستانی اور انگریز دوستوں نے ہیزم کشی کی۔

نواب سر آسمان جاہ کو ان دونوں کا لحاظ تھا اور انھیں ایک کی خاطر سے دوسرے کو ترک کر دینا گوارا نہ تھا۔ نواب محسن الملک بہت دل برداشتہ تھے اور انھوں نے مستعفی ہو کر

ورنہ رخصت لے کر جانے کا قطعی ارادہ کر لیا تھا مگر نواب وقار الملک ان کو روکتے اور اطمینان دلاتے رہے لیکن چوں کہ فتح نواز جنگ کا تقرر ایک اصولی مسئلہ تھا اور مدار المہام کے اختیار پر ضرب پڑ رہی تھی وہ اس بات پر کسی طرح راضی نہ تھے کہ رزیڈنٹ کی ضد پوری کی جائے فتح نواز جنگ نے اس حمایت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور وہ بے باکانہ طور سے پبلک میں بھی نواب محسن الملک کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے یہاں تک کہ انھوں نے نظام کلب کی ایک تقریر میں نواب محسن الملک پر علانیہ طور سے سخت حملے کئے۔ بعض ایسے سرکاری کاغذات بھی مشتہر کئے گئے جن کو مشتہر کرنا کسی طرح موزوں نہ تھا۔

مسٹر ہاول جو اس زمانہ میں رزیڈنٹ تھے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رزیڈنٹ کے اس غیر معمولی اقتدار کو جو نواب سر آسمان جاہ کے زمانہ میں کم ہو رہا تھا بحال کرنے کے لئے نواب محسن الملک کی حمایت میں فریقانہ حیثیت سے شریک ہو گئے اور نواب فتح نواز جنگ کے ہوم سکرٹری کئے جانے کی مخالفت میں انھوں نے اپنی پوری قوت صرف کی۔ گورنمنٹ ہاؤس کے ارکان میں بھی بعض محسن الملک کے اور بعض فتح نواز جنگ کے طرف دار تھے۔

بالآخر لارڈ لینسڈون کو مداخلت کرنی پڑی۔ مسٹر ہاول حیدرآباد سے ہٹا دئے گئے اور ان کی جگہ سر ڈینس فٹز پیٹرک کو مقرر کیا گیا جو نہایت صلح جو نیک دل، وسیع القلب اور عالی منش برطانوی عہدہ دار تھے اور اپنے عہدہ کے اقتدار و اختیار کا مناسب استعمال خوب اچھی طرح جانتے تھے۔

انھوں نے غیر ضروری مداخلت سے اجتناب کیا۔ فتح نواز جنگ ہوم سکرٹری ہو گئے اور فضا میں ایک سکون پیدا ہو گیا۔

نواب محسن الملک کا انہماک اور مدار المہام کا اعتماد

لیکن یہ سکون دو سال سے زیادہ قائم نہ رہا۔ نومبر ۱۸۹۱ء میں سر چیچلی پلوڈن رزیڈنسی پر آئے اور چند ہی دن میں بعض معاملات میں اختلاف رائے کے باعث سر آسمان جاہ کے خلاف ہو گئے۔ ہنوز ایک سال

نہ گذرا تھا کہ نواب سرور جنگ اور سر پلوڈن کی سازشیں شروع ہو گئیں اور سب سے پہلے نہایت خاموشی کے ساتھ نواب وقار الملک پر مؤثر ہوئیں اُنھوں نے وظیفہ کی درخواست پیش کر دی اور ایک ماہ کے اندر اندر حیدرآباد سے روانہ ہو گئے۔

اب نواب سر آسمان جاہ نے نواب محسن الملک پر اپنا پورا اعتماد ظاہر کیا اور نواب وقار الملک کے متعلقہ مہمات اُمور کا بار بھی اُن کے شانوں پر رکھا گیا۔ نواب محسن الملک بھی نہایت ہمدردی اور محنت کے ساتھ معاملات کو صاف کرنے اور نواب سر آسمان جاہ کی ان مشکلات کو جنھیں رزیڈنٹ نے پیدا کر دیا تھا دور کرنے میں منہمک ہو گئے لیکن مطلع تاریک سے تاریک تر ہوتا جاتا تھا اور وہ اکثر مایوس ہو جاتے تھے۔

نواب صاحب کا ایک خط موسومہ نواب وقار الملک

چنانچہ نواب وقار الملک کے جانے کے ایک ماہ بعد اُنھوں نے جو خط بھیجا ہے اس میں ان حالات اور اپنی مایوسی کو یوں لکھتے ہیں کہ :-

"آپ کا عنایت نامہ مدراس سے دوسرا وطن سے آیا تھا جواب نہ پہونچنے پر غالباً آپ نے سوائے کاہلی اور غفلت کے اور دوسرا خیال نہ کیا ہو گا مگر درحقیقت سبب اس کا یہ تھا کہ میں انتظار اس وقت کا کرتا تھا کہ یہاں کے حالات کی نسبت آپ کو اطمینان بخش خبر دے سکوں اور آتشِ فساد کے بجھ جانے کی خوش خبری سناؤں مگر افسوس ہے کہ باوجود صرف اپنی تمام کوشش اور لیاقت کے اس میں کامیاب ہوا گو ابھی ناکامیاب بھی نہیں ہو سکتا نہیں کہہ سکتا اس لئے اب آپ کے دونوں خطوں کا جواب لکھتا ہوں۔

آپ کا جانا اور یہاں کے جھنجالوں سے نکلنا درحقیقت ایک مبارک باد کا امر ہوتا اگر وظیفہ میں کمی نہ ہوتی اور اظہار ناراضمندی حضرت کا۔ مگر مجھے اُمید ہے کہ زمانہ خود ان دونوں باتوں کی تلافی کر دے گا اور آپ کے نیازمندوں کو پھر مبارک باد دینے کا موقع ملے گا۔ اب ہمارا حال سنئے کہ نواب صاحب نے مجھ پر پورا اعتماد کیا اور آپ کے بعد

مجھ سے زیادہ کسی کو اپنے کام کے لائق نہ جانا اور مجھ سے کام لیا اور میں نے بھی نہایت وفاداری اور خیر خواہی سے اپنا فرض ادا کیا اور اپنے آپ کو ریاست کے کام میں وقف کر دیا۔ مگر کچھ ایسی پڑ گئی ہیں کہ اب تک کوئی سعی پوری نہ ہوئی اور نہ اطمینان حاصل ہوا۔ کوشش بدستور جاری ہے اور حضرت اقدس و اعلیٰ کے احکام کی تعمیل اور مرضی مبارک کے مطابق کام کرنے میں ہم سب سرگرم ہیں کیا عجب ہے کہ نواب صاحب کی وفاداری اور اطاعت اپنا نیک نتیجہ دکھائے اور شورش بند ہو جائے ورنہ بہت جلد بندہ بھی پہنچتا ہے اور علی گڑھ میں آکر ملتا ہے۔

اصلاحات جدیدہ میں شرکت

اسی عرصہ میں اعلیٰ حضرت نے ملک میں کچھ اصلاحات فرمانے اور مدار المہام کی ذمہ داریوں کو وزرائے ماتحت پر تقسیم کئے جانے کے متعلق ایک یادداشت تیار فرمائی اور مدار المہام کو حکم دیا کہ اس کی نسبت اپنے مشیروں سے کامل مشورہ کرنے کے بعد رائے کا اظہار کریں۔ چنانچہ اس کے متعلق اعلیحضرت کی ڈیوڑھی میں چھ اعلیٰ عہدہ داروں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی جس میں نواب محسن الملک بھی بحیثیت ایک رکن کے شریک ہوئے اور مختلف جلسوں میں امور مندرجۂ یادداشت پر بحث اور غور ہونے کے بعد مدار المہام نے اپنی رائے پیش کی جو منظور ہونے کے بعد ایک قانون کی صورت میں لائی گئی اور پھر ایک قانون جو "قانونچۂ مبارک" کے نام سے موسوم ہوا جاری کیا گیا۔

اس جدید اصلاحات کی اسکیم میں بہت کچھ تغیرات ہوئے اور ایک کیبنٹ کونسل یعنی مجلس وزرا بھی قائم ہوئی اور معتمدین کا تعلق معین المہاموں (وزرائے ماتحت) سے رکھا گیا لیکن نواب محسن الملک بدستور فنانشل سکرٹری رہے اور اُن کا تعلق براہ راست مدار المہام سے رہا اور ایک لائق کنٹرولر جنرل آف اکونٹس اُن کی امداد کے لئے منظور کیا گیا۔

ایک مجلس واضع آئین و قوانین بھی قائم کی گئی اور محسن الملک بھی اس کے رکن مقرر کئے گئے۔ یہ جدید انتظامات و اصلاحات مملکت نظام کے ہر صیغہ پر حاوی تھیں اور اس کے اصول

وضعی قواعد بنانے میں کئی ماہ تک نواب صاحب کو غیر معمولی اور سخت محنت کرنی پڑی اور حق یہ ہے کہ ان اصلاحات کی ضخیم جلد بہت زیادہ اُن کی دماغی قابلیت و محنت کا نتیجہ ہے۔

بعض اشخاص کا یہ خیال ہے کہ یہ اسکیم خود نواب محسن الملک ہی کے دماغ کا نتیجہ تھی جو سرور جنگ کی تائید سے اعلیٰ حضرت کی روبکاری میں پیش کی گئی۔ اعلیٰ حضرت نے مسٹر پلوڈن سے مشورہ کیا اور اُنھوں نے بھی پسند کیا۔ البتہ معتمدین (سکریٹریوں) کے متعلق ترمیم کی گئی اور چیف سکریٹری کے عہدہ سے جس پر نواب محسن الملک کو نامزد کیا گیا تھا اختلاف کیا۔

ایک خیر خواہانہ مشورہ جو خطرناک سازش بنا دیا گیا تھا

اس زمانہ میں معتمد پیشی نواب[1] سرور جنگ تھے جن کو پیشی اور رزیڈنسی میں غیر معمولی اقتدار اور اثر حاصل تھا۔ ان ہی کے اثرات سے نواب وقار الملک جو مدار المہام سر آسمان جاہ کے مشیر معتمد تھے رخصت ہو چکے تھے اُنھوں نے

---

[1] آغا مرزا (نواب سرور جنگ سرور الدولہ سرور الملک) اودھ کے باشندے ہیں۔ سر خورشید جاہ جو سر سالار جنگ کے خاندانی مخالف اور سر آسمان جاہ کے رقیب تھے۔ ان پر خاص مہربانیاں کرتے تھے اور نواب سرور جنگ کو (۶۰۰۰) سالانہ کی جاگیر بھی عطا کی تھی۔ یہ اپنے مربی کی کوشش سے سر سالار جنگ کے انتقال کے پانچ ماہ بعد اعلیٰ حضرت کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے اور چونکہ نہایت ذہین آدمی تھے اس لئے ان کا اعلیٰ حضرت کی طبیعت پر زبردست اثر قائم ہو گیا تھا۔ اتالیقی کے بعد رزیڈنٹ کی سفارشوں سے معتمد پیشی کے عہدہ پر ممتاز کئے گئے اور خاندان کے متعدد لوگوں کے مشاہرات بطور منصب مقرر ہوئے ۳۰ شعبان سنہ ۱۳۱۴ھ مطابق سنہ ۱۸۹۷ء کو بعطائے وظیفہ اپنی خدمت سے علیحدہ کئے گئے اور ہمیشہ کے لئے حیدرآباد کو خیر باد کہا۔

آغاز سنہ ۱۸۹۲ء میں جب کہ نواب فتح نواز جنگ بہ حصول رخصت کشمیر میں تھے ایک نوجوان سدھ متر نامی بنگالی نے جو چادر گھاٹ میں اخبار نویسی کا پیشہ کرتا تھا ایک گمنام پمفلٹ شائع کیا جس میں مسز مہدی حسن کی نسبت انتہائی فحش اور گندہ الزامات قائم کئے گئے اور اس کو ایک ذلیل پیشہ ور آوارہ عورت بتلایا گیا اور اس سلسلہ میں انتہائی غلیظ الزامات سابق وزیر عماد السلطنت سالار جنگ ثانی پر بھی لگائے گئے اور پھر ملکہ معظمہ کی بیوی کی باریابی کا تذکرہ کر کے شریف سوسائٹی کو اس کے ملنے جلنے سے غیرت دلائی گئی۔

اس پمفلٹ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فتح نواز جنگ کو اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے متر پر دعوی کرنا پڑا اور وہ دورانِ تحقیقات میں معطل کر دیئے گئے۔ مقدمہ رزیڈنسی کی حدود میں مجسٹریٹ سکندرآباد کی عدالت میں دائر کیا گیا۔

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

ہی فتح نواز جنگ کے خلاف پمفلٹ کیس میں ملزم کی امداد میں زبردست مالی و اخلاقی امداد دی تھی۔

ان پر مسٹر بلوڈن کی خاص نظر توجہ تھی اور مسٹر بلوڈن پر اُن کا خاص گہرا اثر تھا اور چوں کہ امرائے خاندان و ریاست میں وزارتوں کی زبردست خواہشیں اور عہدہ داروں میں اقتدار و اختیار کی زبردست خواہشیں موجود تھیں اس لئے اُن کی ذات اُمیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن گئی تھی۔

نواب سر آسمان جاہ ایک خاص طبیعت اور اخلاق کے امیر تھے اور وہ ہر چیز پر اعلیٰ حضرت کی خوشنودی اور مرضی مبارک کو مقدم جانتے تھے وہ ریاست کے صحیح اقتدار کو برقرار رکھنے کے آرزومند تھے رزیڈنٹ سے اگرچہ مخالفت کرنا نہیں چاہتے تھے اور اُس کی قوت سے واقف تھے لیکن اندرونی معاملات میں اس کی مداخلت بھی گوارا نہ تھی۔

امرا کی سازشیں رنگ لا رہی تھیں ریاست کا مطلع ان سازشوں سے مکدّر ہو چکا تھا پمفلٹ کیس جاری تھا۔ رزیڈنٹ سے ناگزیر طور پر اختلاف پیدا ہو گئے تھے۔ سرور جنگ میں اور اُن میں کبھی اچھے تعلقات نہ تھے اور پمفلٹ کیس کی وجہ سے اور زیادہ تعلقات خراب ہو گئے تھے اس سے ان کو بہت سے تردّدات تھے اور وہ سکون و اطمینان کے ساتھ ریاست کے نظم و نسق میں مصروف رہنا چاہتے تھے۔ نواب محسن الملک بھی پُرسکون فضا کے متمنی اور کوشاں تھے۔ ان حالات میں نواب[لے] سر آسمان جاہ نے بارہا لوگوں سے یہ سنا کہ سرور جنگ نے ان کے مخالفین کی مدد و مشورہ سے ان کی متعدد شکایتیں کیں اور فتح نواز جنگ کے مقدمہ میں ان کو بہ حیثیت شاہد کے بھی پیش کرانا چاہتے ہیں جو اعلیٰ حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ملزم کی طرف سے مسٹر مارٹن اور دیگر بیرسٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں اور اب جو بڑی بڑی شخصیتیں پس پردہ تھیں نمایاں ہوگئیں۔ عام طور سے نواب سرور جنگ اور شمس العلماء سید علی بلگرامی ملزم کے معاون تصوّر کئے گئے۔ ثبوت و صفائی میں بڑے بڑے لوگوں مثل نواب عماد الملک نواب فریدوں جنگ میجر گف وغیرہ کی شہادتیں ہوئیں کمیشن جاری ہوئے اور ڈیفینس کی طرف سے بیدریغ روپیہ صرف ہوا اور یہ روپیہ مختلف طریقوں اور وعدوں سے عہدہ داروں اور امیروں کی جیبوں سے حاصل کیا گیا اور یہ شہرت دی گئی کہ ڈیفینس کی امداد اعلیٰ حضرت کی خوشنودی کا باعث ہوگی۔ بالآخر بہت سی بدنامیوں اور رسوائیوں کے بعد مقدمہ اس بنا پر خارج ہو گیا کہ حدود رزیڈنسی میں لائبل واقع نہیں ہوئی ۱۲

لے یہ اقتباس نواب سر آسمان جاہ اور نواب محسن الملک کے بیانات سے لیا گیا ہے۔

اور گورنمنٹ آف انڈیا کی ناخوشی کا باعث ہوگا۔ اُنھوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ چند صیغۂ راز کے کاغذ جو اعلیٰ حضرت کی پیشی میں مدار المہام نے پیش کئے تھے ظاہر کر دیں گے۔ اسی اثنا نواب محسن الملک اور دیگر عہدہ داروں نے کوشش کی کہ ان دونوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں جو ریاست کے لئے نہایت مفید ہوگا۔ سرور جنگ کئی مرتبہ نواب سر آسمان جاہ سے ملے اور ان کی گفتگو سے مترشح ہوا کہ ان کی ناراضی اس بنا پر ہے کہ اُن کے خیال میں نواب سر آسمان جاہ فتح نواز جنگ کو مدد دے رہے ہیں۔

نواب محسن الملک کو اگست ۱۸۹۲ء میں ایک شخص مرزا غضنفر علی بیگ[۱] کے ذریعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ سرور جنگ کو روپیہ کی ضرورت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ سر آسمان جاہ ان کی مالی امداد کریں اور یہ بات ظاہر تھی کہ سرور جنگ کو اس مالی نقصان کے پورا کرنے کے لئے جو پمفلٹ کیس سے ہوا روپیہ کی اشد ضرورت تھی۔ نواب محسن الملک نے مصلحت وقت کے لحاظ اور اس یقین سے کہ اس زمانہ میں ہر قسم کی غلط فہمی مٹانے کے لئے اس قسم کا عطیہ بہترین ذریعہ ہے، سر آسمان جاہ کو مشورہ دیا کہ اگر کچھ مالی مدد دے دی جائے گی تو اُن کی بدگمانیاں دور ہو جائیں گی اور اس بخشش و عنایت سے کوئی ہرج نہ ہوگا۔

نواب سر آسمان جاہ نے اپنے مشیر قانونی اور بعض عہدہ داروں سے مشورہ لیا اور سب نے اطمینان دلا دیا کہ ایسی بخشش خلاف ضابطہ نہ ہوگی تو نواب سر آسمان جاہ نے ایک لاکھ روپیہ دیا جانا منظور کر لیا اور اکتوبر کی آخری یا نومبر کی ابتدائی تاریخوں میں غضنفر علی بیگ کے ذریعہ ہی سے اطلاع دے دی گئی۔ سرور جنگ بہت خوش ہوئے اور ان کے برتاؤ میں تغیر پیدا ہو گیا۔ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت کی طرف سے نواب سر آسمان جاہ کے پاس یہ خبر لائے کہ "وہ اعلیٰ حضرت اپنے مدار المہام کے عمدہ انتظامات سے بہت خوش ہیں"۔ اسی طرح انھوں نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ "وہ کہ انھوں نے رزیڈنٹ سے بھی وزیر اعظم کے متعلق بہت تعریف کی ہے"۔

لیکن اتفاقاً روپیہ بھیجنے میں بہت کچھ توقف ہوا جس سے ۱۴ ؍ نومبر کو مرزا صاحب کے ذریعہ سے

---

[۱] ایک منصب دار تھے اور اعلیٰ سوسائٹی میں اُن کا رسوخ تھا۔ سرور جنگ سے عمدہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔

روپیہ موصول ہوگیا تو وہ مطمئن ہو گئے اور ان اختلافات وحالات میں سکون پیدا ہو گیا اور اصلاحاتِ ملکی کی جدید تجاویز بروئے کار آئیں۔ روپیہ کی ادائگی کے کچھ دن بعد سرور جنگ نے نواب محسن الملک سے یہ بھی بیان کیا کہ "میں نے اعلیٰ حضرت سے عرض کر دیا ہے کہ نواب سر آسمان جاہ سے ایک لاکھ روپیہ لیا ہے سکیں ہیں اپنے فرائض منصبی کے انجام دینے میں اسی طرح مضبوط رہوں گا جیسا کہ اب تک رہا ہوں۔

مارچ ۱۸۹۳ء میں فتح نواز جنگ نے مسٹر پلوڈن کو دو خط بھیج کر اس واقعہ کی اطلاع دی اور اس عطیہ کو استحصال بالجبر سے تعبیر کر کے لکھا کہ نواب سر آسمان جاہ کو اس کے بغیر چارہ ہی نہ تھا کیوں کہ انتظام ملکی اور بہبودیِ سلطنت کا یہی مقتضا تھا ورنہ سخت رخنہ اندازی ہوتی ۲۴ مارچ کو مسٹر پلوڈن نے نواب سر آسمان جاہ کے پاس ان خطوط کی نقل بھیج کر واقعیت اور اصلیت معاملہ دریافت کی اور یہ بھی لکھا کہ :-

"جو الزامات اس تحریر میں سرور جنگ پر لگائے گئے ہیں بالکل ناقابلِ یقین ہیں لیکن وہ اس قدر اہم ہیں کہ انھیں بغیر دریافت کئے ہوئے نہیں چھوڑا جا سکتا"

اس بنا پر نواب سر آسمان جاہ اور نواب محسن الملک اور مرزا غضنفر علی بیگ کے تحریری بیانات اعلیٰ حضرت کے سامنے پیش ہوئے جن میں متذکرۂ بالا واقعات کا نہایت صفائی اور وضاحت سے اندراج تھا لیکن نواب سرور جنگ نے جو بیان دیا اس میں اس عطیہ کی تحریک اور اس کے قبول کرنے پر اصرار کا سارا الزام نواب سر آسمان جاہ اور نواب محسن الملک کے ذمہ رکھا اور ظاہر کیا کہ اُن کی مرضی کے خلاف یہ روپیہ دیا گیا تھا۔

مسٹر پلوڈن کو اس تحقیقات سے خاص دلچسپی تھی اور اُنھوں نے ان سب کے بیانات میں صرف معتمد پیشی کے بیان کو صحیح و وقیع باور کیا۔

نواب محسن الملک کا استعفا اور وظیفہ

نواب محسن الملک اس نتیجہ[۱] سے بہت دل برداشتہ ہو گئے اور اُنھوں نے رزیڈنٹ کی خواہش دایما پر ۳ شہر یور ۱۳۰۲ فصلی مطابق

---

[۱] سر آسمان جاہ نے مدار المہام کے عہدہ پر سرفراز ہونے کے بعد ہی اپنے متقدم جانشین کے واقعات سے متاثر ہو کر ایک
(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

۱۲ر جولائی ۱۸۹۳ء کو استعفا پیش کر دیا۔ اعلیٰ حضرت نے استعفا منظور فرما لیا اور تاریخ استعفا سے آٹھ سو روپیہ سکۂ حالی ماہانہ وظیفہ (پنشن) مقرر کیا گیا۔

حیدرآباد سے رخصت کا نظارہ

۱۸۷۴ء میں جب کہ نواب صاحب پہلی مرتبہ حیدرآباد میں داخل ہوئے ہیں تو بجز دو چار دوستوں کے اور کوئی استقبال کے لئے نہ تھا اس کے بعد متعدد مرتبہ وہ آئے اور گئے اور اُن کے ماتحتوں اور دوستوں نے مشایعت اور استقبال کیا مگر اب وہ ۱۸۹۳ء کی پہلی شش ماہی کو بیس سال کا زمانہ ختم کر کے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتے ہیں اور اس طرح رخصت ہوتے ہیں کہ آج تک کسی عہدہ دار کو حیدرآباد چھوڑتے وقت یہ عزّت حاصل نہیں ہوئی نہ کسی نے محبّت وحسرت کا یہ نظارہ دیکھا۔

اقتباس اخبار جریدۂ روزگار مدراس

جریدۂ روزگار مدراس کے نامہ نگار نے لکھا ہے کہ:-

"غرہ محرم کا، روز شنبہ کا وقت صبح کا ۱۳۱۱ھ ہجری نبوی وہ تاریخ وہ یوم وہ وقت وہ سنہ ہے کہ ایک ہر دل عزیز، محبوب، خلیق، سیّد عالی نسب والاحسب مولانا مولوی سید مہدی علی خاں بہادر نواب محسن الملک معتمد فنانشل دولت نظام خلّد اللہ ملکہ وسلطنتہ کی حیدرآباد سے الوداع ہے جس کی جدائی سے ماہ محرم کا غم دوہرا ہو رہا ہے۔ یہ نیا سال نیا روز صفحۂ تاریخ دکن پر یادگار ہے کہ اسی تاریخ سے دکن کی تاریخ کا نیا رنگ، نیا ڈھنگ جلوہ گر ہے خدا انسان پیدا کرے تو ایسا ہر دل عزیز کرے کہ جس کی جدائی پر خاص وعام مرد وزن، ہندو مسلمان، انگریز پارسی نوحہ زن ہوں۔ گمان تھا کہ نواب مہدی علی خاں کی مشایعت کے لئے بہ لحاظ عتاب اعلیٰ حضرت کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) گزارش بطور استعفا بلا تاریخ بارگاہِ خسروی میں پیش کر دی تھی کہ جس وقت اعلیٰ حضرت کی مرضی مبارک ہو اس کو فوراً کام میں لایا جائے اب اس حالت میں کہ رزیڈنٹ نواب وقار الامرا کی جو طبعاً کمزور تھے اور بقول مسٹر بلنٹ کے کہ "کاڈری کے سامنے مثل بچّوں کے کانپتے تھے" وزارت کا ساعی تھا، نواب سر آسمان جاہ نے بھی نواب محسن الملک کے مستعفی ہونے کے پانچ ماہ بعد ان حالات سے متاثر ہو کر استعفا داخل کر دیا۔

شخص ریل تک نہ آئے گا مگر گمان بالکل غلط نکلا۔ سات بجے سے لوگوں کی آمد شروع ہوئی آدھ ساعت میں غم خواران سید کا وہ ہجوم ہوا کہ پلیٹ فارم بھر گیا۔ اسٹیشن کے باہر سواریوں کا ہجوم ہو گیا جو آیا سیّد کے آگے خمیدہ ہوا۔ اشکِ حسرت و یاس سے دامن کو تر کرنے لگا۔ صدہا لوکل عہدہ داران دولت، اکثر اعزّۂ شہر اور نامی ساہوکار، لیڈیانِ محترم، اکثر ملازمانِ دولت جمع تھے۔ اسٹیشن کے باہر صدہا کم درجے کے لوگ آہ و فغاں کر رہے ہیں۔ جب ٹرین کے چلنے کا وقت آیا انگریزوں نے ٹوپیاں اُتار کر نعرہ ہُرّے کا مارا اور سارے مجمع میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ کوئی سنگدل ایسا نہ ہو گا جس نے اس منظر عبرت خیز کے ملاحظہ پر آنسو نہ بہائے ہوں۔ یہ پہلا وقت ہے جو ہم نے اس مستقل مزاج متحمّل سیّد کو بے اختیار پایا۔ ٹرین گئی اور ایک سکتہ و حیرت کا عالم طاری ہو گیا۔ اکثروں کو دیر تک بے خود و بے حواس پایا۔ سچی عزّت۔ سچی وقعت اسی کو کہتے ہیں کہ ایسے عالم میں اس قدر عزّت کی جائے۔ ہر کہ و مہ کی زبان پر ہائے مہدی علی وائے محسن الملک ہی ہے۔ اس وقت کا سماں جو کوئی سنتا ہے اس کا کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ امیر و غریب یکساں سوگوار اور غم خوار نظر آتا ہے۔ یہ عام غم خوار کسی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہوئے کبھی نظر نہ آئے۔ عوام میں یہ مشہور ہو رہا ہے کہ صاحب عالی شان اس ریاست کے لائق و خیر خواہ لوگوں کو الگ کر رہے ہیں کہ آئندہ کوئی عقل مند یہاں رہے نہیں اور پھر اپنی مداخلت اچھی ہو جائے اور انگریزی حکومت ہو جائے ہر چند کہ کوئی دانا ایسے لغو خیالات پر توجہ نہیں کر سکتا ہے مگر ایسے خیالات کا پیدا ہونا سراسر خلاف مصلحت ہے۔ برٹش گورنمنٹ ایک لحظہ پسند نہیں کرے گی کہ ایسے خیالات کا تخم دکن میں بو یا جائے بلکہ حتی الامکان ایسے خیالات کے بنا کی جڑ ہی کو اکھاڑ دے گی۔ غرض کہ غرّۂ محرم سے دکن کی تاریخ کا نقشہ بدل گیا ہے۔ ہر طرف سوگواری سوگ واری ہی ہے۔ نواب محسن الملک بہادر کیا گئے کہ

عیش ونشاط شہر لوٹ لے گئے۔ خدا ان کو خوش رکھے۔ جہاں رہیں باعزت وحرمت رہیں۔ نواب ممدوح متعلقین کو چھوڑ کر تنہا چھوڑ کر تنہا راہی علی گڑھ ہو گئے ہیں وہیں قیام گزین رہیں گے۔ مکان وسامان اور تعلقات دکن کے قطع کا بندوبست کرنے کے بعد متعلقین کو بلوالیں گے۔ نواب ممدوح کی آخری یادگار نظم ونسق پنج سالہ عہد وزارت سر آسمان جاہ بہادر ہے جس کو مرتب کئے مہینہ ایک کا عرصہ ہوا جس میں بلحاظ عمدہ مالی حالت کے عہدۂ وزارت عالیہ کو جلوہ افروز ومشہور کر دیا ہے۔

اقتباس اخبار آزاد

اسی حسرت آمیز سین کو اخبار آزاد کے نامہ نگار نے بھی اپنے دل گداز الفاظ میں کھینچ کر لکھا ہے کہ آپ کی روانگی سے دو روز پیشتر لوگ بکثرت آپ سے ملنے اور آپ کو وداع کرنے ٹھیک ساڑھے سات بجے اسٹیشن ریلوے پر جلوہ فرما ہوئے۔ مولوی صاحب کے آنے سے پہلے ایک جانب ہزارہا آدمی انگریز وپارسی وجنٹلمین اور لیڈیاں ہندو مسلمان جن میں اکثر سرکاری عہدہ دار وغیرہ وغیرہ تھے۔ دوسری جانب ایک کثیر التعداد بیوہ عورتوں کا گروہ اپنے چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کو گود میں لئے ہوئے مولوی صاحب کے وداعی رنج میں شریک ہونے کے لئے موجود تھا۔ ان بے کس بیوہ عورتوں کا زار زار رونا اور نواب محسن الملک بہادر کا دردانگیز آواز سے اُن کی دلدہی اور خاطرداری کے الفاظ کہنا۔ اللہ اکبر ہم نے کیا بلکہ کسی نے آج تک کسی عہدہ دار کی روانگی پر اس طرح خاص وعام کو وداعی تقریب میں شریک ہوتے نہیں دیکھا۔ جس وقت مولوی صاحب نے ہر ایک سے معانقہ کر کے ریل پر قدم رکھنا چاہا تھا کہ ایک بیوہ عورت نے اپنے یتیم بچے کو مولوی کے روبرو ڈال دیا۔ اب تک تو مولوی صاحب نے خودداری سے کام لیا تھا لیکن اس وقت بہت زار وقطار رونے لگے اور مسٹر فرید دل جی صاحب پرائیویٹ سکرٹری کو مخاطب کر کے فرمایا کہ :۔

"سرکار میں غلام کی جانب سے قدمبوسی کے بعد عرض کرنا کہ جب تک فدوی تھا ان غریب عورتوں کو جس طرح بن سکا نباہا۔ اب میری آخری سفارش ہے جو میں ان عورتوں کے

سے کرتا ہوں اور اُن کا مجموعی خرچ دو سو روپیہ سے زیادہ نہیں ہے ان بکسیوں کی پرورش کا سرکار کو خیال رہے۔"

یہ کہہ کر مولوی صاحب نے پھر ضبط کو خیر باد کہہ دیا اور سینہ پر ہاتھ رکھے ہوئے ٹرین پر سوار ہو گئے پھر تو ریل کی سیٹی کی آواز تک بھی لوگوں کے رونے اور چلّانے میں سنائی نہ دیتی تھی

سازشوں پر تبصرہ

پارٹیوں اور شخصیتوں کے عروج و زوال کے لئے تقریبًا ہر ملک و قوم میں خاص جذبات ہوتے ہیں اور اس مدعا کے حاصل کرنے کے لئے سازشیں بھی کی جاتی ہیں لیکن محکوم اور زیر دست ملکوں میں ایسے جذبات اور ایسی سازشوں کے اثرات و نتائج نہایت تباہ کُن ثابت ہوتے ہیں اور علی الخصوص ہندوستانی ریاستیں ان تباہیوں کا عبرت ناک منظر بن جاتی ہیں۔

یہ ریاستیں اگرچہ ان معاہدات کی رو سے جو سلطنت برطانیہ کے ساتھ ہیں اندرونی طور پر خود مختار و آزاد ہیں لیکن یہ خود مختاری و آزادی ایک غیر مکتوب قانون کی رو سے رزیڈنٹ اور ویسرائے کی مرضی کے تابع ہے۔

یوں تو عامۃً حکومت اعلیٰ کے عہدہ دار اس خود مختاری اور آزادی کا احترام کرتے ہیں اور غیر ضروری مداخلت سے اپنی گورنمنٹ کو بچاتے ہیں مگر جب کوئی خاص پالیسی گورنمنٹ نے قرار دے لی ہو اور اس کو عمل میں لانا چاہتی ہو یا اندرونی نظم و نسق ملکی بے حد خراب ہو اور رعایا کی جان و مال کی سلامتی خطرہ میں پڑ جائے تو مختلف صورتوں میں مداخلت شروع ہو جاتی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ایک خاص شکل ہے یعنی جب کوئی سر لیپل گریفن، سر ملیوڈن اور کرنل ہنچن جیسا اقتدار پسند رزیڈنٹ ہوتا ہے تو وہ بہ لحاظ ضرورت محض بہ مقتضائے طبیعت اپنے اُن غیر محدود اختیارات کا استعمال شروع کر دیتا ہے جس کی عظمت و اثر کا اندازہ صرف والیانِ ملک اور مدار المہاموں کو ہی ہوتا ہے اور خواہ یہ اختیارات ناجائز طور پر ہی کیوں نہ استعمال کئے جائیں حکومتِ اعلیٰ بادل ناخواستہ اس کی تائید کرتی ہے کیوں کہ اس وقت اس کے سامنے اقتدار

(پرسٹیج) کا مسئلہ حائل ہو جاتا ہے۔
پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی مداخلت خواہ ویسرائے کی مرضی سے ہو یا رزیڈنٹ کی گفتگوؤں اور مخفی مراسلات کی بنا پر بعض صورتوں میں ریاستوں کی رعایا کے لئے رحمت ثابت ہوتی ہو مگر اکثر صورتوں میں اس کے اثرات اتنے خراب نکلتے ہیں کہ قدرتی طور پر فرماں روا کے جذبات عقیدت تک مجروح ہو جاتے ہیں۔ ریاستوں میں اکثر عہدہ دار ایسے ہوتے ہیں جن کو رزیڈنٹ کی عنایتوں اور نوازشوں درباری اعزازوں اور ستارۂ ہند سر اور نائٹ کے اعلیٰ خطابوں کی انتہائی تمنائیں ہوتی ہیں اس لئے ان کی سمت قبلہ رزیڈنسی ہوتی ہے اور وہ اپنے آقا کے مقابلہ میں رزیڈنٹ کی خوشنودی کو مقدم سمجھتے ہیں اور ہر معاملہ میں اس کی مرضی کے تابع اور اُس کی خوشنودی کے جویاں رہتے ہیں اور جب رزیڈنٹ کے الطاف وعنایت کی قوت ان کی پشت پر ہوتی ہے تو ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ وہ اپنے ولی نعمت کے مفاد کو بھی قربان کرنے میں تامل نہیں کرتے۔

اس گروہ میں ریاستوں کی سروس کے انگریز اور وہ عہدہ دار جن کی خدمت کا استعارہ کیا جاتا ہے خصوصیت سے قابل لحاظ ہیں۔ مستعار عہدہ داروں میں شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے کہ جس نے رزیڈنٹ کے خیال مرضی خیال کرنے کی جرأت بھی کی ہو اور اگر جرأت کی بھی ہو تو وہ مخفی یا علانیہ عتاب سے محفوظ رہا ہو۔ انگریزوں میں غالب تعداد اپنی ملازمت کے تحفظ اور اپنے قومی وقار کو بڑھانے کے لئے رزیڈنسی کی طرف رُخ کئے رہتی ہو اور اُن کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی تجاویز میں رزیڈنٹ کی امداد حاصل ہوتی رہے۔

امرائے ریاست میں بھی ایک گروہ ایسا ہوتا ہے کہ جس کے دل میں ریاست کے مراتب اعلیٰ کی آرزو جاگزیں ہوتی ہے یا رئیس و فرماں روا سے کوئی وجہ ہو جاتی ہے اس حالت میں وہ رزیڈنسی کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور امیدوں میں کامیابی یا اپنی سلامتی رزیڈنٹ کو خوش رکھنے اور اپنا طرف دار بنانے میں دیکھتا ہے۔

ایک اور طبقہ بھی ہوتا ہے جس کو ریاست کی ملازمت سے تعلق نہیں ہوتا اور تجارت دولت کا

یا دوسرے اور آزاد پیشوں میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے لیکن ان فرقہ بندیوں میں اور عہدہ داروں کے مزاج میں اس کو بڑا دخل اور رسوخ حاصل ہوتا ہے۔

مدارالمہام کا تقرر اور عزل ونصب گورنمنٹ کی منظوری کا محتاج رکھا گیا ہے جو منظوری کہ علی العموم رزیڈنٹوں کے مشوروں پر مبنی ہوتی ہے اور اس کا دل بھی ان امیدوں سے خالی نہیں ہوتا جو رزیڈنٹوں کی خوشنودیوں کا ثمر شیریں ہیں اور اگر وہ ان امیدوں کو پیدا نہ ہونے دے اور استقلال و بے لوثی اور اپنے آقا کی سچی وفاداری کے ساتھ کام کرے اور اس میں کوئی تصادم واقع ہو جائے تو ناممکن ہے کہ وہ رزیڈنٹ سے کسی شدید اختلاف کی جرأت کر سکے اور اگر کرے تو اس کے نتائج کی تاب لا سکے۔

فرماں روائے ملک کی رگوں میں خواہ کیسا ہی بہادرانہ خون ہو اور وہ کتنا ہی زبردست مدبر اور روشن ضمیر کیوں نہ ہو اپنے ارادے، اپنے مصالح اور اپنی خوشی کو رزیڈنٹ کی مرضی کے خلاف عمل میں نہیں لا سکتا اور رزیڈنٹ کا رعب یا خوف اکثر وبیشتر اس کے جذبات پر غالب آ جاتا ہے۔

ان حالات وواقعات اور فضا میں وہ ایمان دار عہدہ دار بھی خواہ ہندوستانی ہوں یا انگریز جو ایک خاص جذبہ کے ساتھ محنت ودیانت سے اپنے فرائض ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں اور اپنا رخ اپنے آقا کی طرف رکھتے ہیں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنے سے گھبراتے ہیں اپنی حکومت کے مفاد کو اپنے منطقی دلائل اور واقعاتی نتائج سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ان کو ایسی شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے کہ دل شکستہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر مخالف پارٹی یا اپنے اغراض میں ڈوبی ہوئی جماعت اس ایمان دار آدمی کو ضدی اور گورنمنٹ کا باغی اور حکومت کا خراب مشیر ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کو مجبوراً خاموش رہنا یا مستعفی ہونا پڑتا ہے یا وہ جبریہ طور سے علٰحدہ کیا جاتا ہے۔

حیدر آباد اس قسم کے واقعات و تعلقات کی ایک عظیم ترین اور بد ترین مثال رہا ہے۔ اور جس زمانہ سے کہ ہمارے صاحبِ سوانح کا تعلق ہے اس میں ہم ایسے ہی دل شکن اور افسوس ناک حالات و واقعات بکثرت پاتے ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ گزشتہ صدی میں سر سالار جنگ اوّل اپنی بہترین قابلیتوں اور اعلیٰ صفات کی وجہ سے ہندوستانی مدبّرین کی صفِ اوّل میں سب سے اوّل نمبر پر تھے۔ اپنے آقا اور اپنے مُلک کی خیر خواہی سلطنت برطانیہ کی وفاداری اُن کے وہ مسلّمہ خصوصیات ہیں جن کا اُن کے شدید ترین دشمنوں کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان و انگلستان میں جو سرکاری اعزاز ان کو حاصل ہوئے وہ آج تک کسی ریاست کے مدار المہام حتّٰی کہ اکثر والیانِ ملک کو بھی نصیب نہیں ہوئے لیکن ان کو بھی بعض رزیڈنٹوں سے سخت تکلیفیں پہنچیں ان کی راہ میں مشکلات حائل کی گئیں۔ اُن کو ذلیل کیا گیا اور ان کی جان لینے کی کوششیں ہوئیں اور یہ سب کچھ محض چند رقیب اُمراء کی تمنّائے وزارت اور مسئلۂ برار کی وجہ سے ہوا۔

عماد السلطنت سر سالار جنگ ثانی اور اعلیٰ حضرت کے اختلافات اور اس کے افسوس ناک انجام میں بھی پس پردہ یہی ہاتھ کام کر رہے تھے[۱]۔

سر آسمان جاہ کے دورِ وزارت میں بھی وہی جماعتیں مصروف کار رہیں۔

نواب فتح نواز جنگ اور ان کی بیوی کے خلاف پمفلٹ کی اشاعت، دائرہ مقدمہ ڈیفنس کی قوت اور مالی امدادیں یہ سب کچھ زوال وزارت اور جماعتوں کے تکمیل مقاصد کی خاطر ہوا۔

---

[۱] یہ واقعات کسی قدر اجمال کے ساتھ کتاب "انڈیا انڈر رپن" میں نظر آئیں گے جو مسٹر بلنٹ مشہور ممبر پارلیمنٹ کی لکھی ہوئی ہے اور جس کا بہت زیادہ حصہ ذاتی معلومات و مشاہدات پر مبنی ہے۔

نواب محسن الملک کے خلاف وقتاً فوقتاً جو سازشیں ہوتی رہیں وہ علی العموم ناکام رہیں لیکن ایک سازش جس نے اُن کی حیدرآبادی زندگی عروج وبہار کو دائمی اور روحانی گلفتوں کو بدل دیا تھا بلاشبہ نہایت کامیاب رہی۔

تین ہی سال بعد ایک اور انقلاب ہوا جب کہ نواب سرور جنگ سرچیچلی پلوڈن کی مہربانیوں اور مربیانہ نوازشوں سے حیدرآباد میں سب سے زیادہ ممتاز اور اعلیٰ شخصیت حاصل کر چکے تھے اور چومحل مبارک اور ایوان رزیڈنسی دونوں جگہ انھیں کا طوطی بول رہا تھا کہ یکایک سرپلوڈن کی نظر بدلی اور ایک ہی تابشِ نظر میں وہ تمام عروج واقتدار سیاہ تاب ہوگیا اور فوراً حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

انھوں نے شمالی ہند میں آکر پہلا کام یہ کیا کہ انگریزی میں ایک پمفلٹ تیار کر کے جس میں ان سازشی حالات پر روشنی ڈالی تھی (جیسا کہ اُنھوں نے مؤلف کتاب ہذا سے بیان کیا تھا) خود وئسیرائے ہند کی خدمت میں اس کو پیش کیا۔

ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں کہ وہ کس مقصد یا غرض سے لکھا گیا تھا لیکن اس میں نواب محسن الملک کی بگناہی، مظلومیت اور تنظیم سازش کی جو جھلک پاتے ہیں وہ ناظرین کے ملاحظہ میں پیش کر کے اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ وہو ہذا:

"یہ واقعہ مثل میں موجود ہے کہ ہز ہائنس ابتدا سے سروقارالامرا کو وزارت پر مقرر کرنے کے سخت خلاف تھے اور اپنے خیالات کا اظہار انھوں نے مسٹر پلوڈن پر بھی کر دیا تھا۔ ہز ہائنس نے جس قدر زیادہ ان کی مخالفت کی مسٹر پلوڈن نے اتنا ہی زیادہ اصرار ان کی تقرری پر کیا اور اگر میں نظام کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتا کہ وہ مسٹر پلوڈن ہی کی خوشی ہو جانے دیں تو مجھے یقین ہے کہ تمام ہندوستان اس واقعہ سے زیادہ متحیر اور متاثر ہوتا بمقابلہ اس پولٹیکل ضرورت کے جس سے کہ میں حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور ہوا۔

مسٹر پلوڈن نے اپنے نامزدہ شخص کو وزارت دلانے میں اپنی ضدی طبیعت سے اس قدر کام لیا کہ منجملہ اور فضول چالیں چلنے کے وہ سرآسمان جاہ پر مقدمہ بنانے کی کوشش میں

مشغول ہو گئے وہ اس طرح کہ اُنھوں نے جواد حسین پر مقدمہ چلانے پر بے حد زور دیا
اور یہ واقعہ اب تک حیدرآباد کی پبلک میں تازہ ہی - اس غریب پر یہ سنگین چارج
لگایا گیا کہ اُس نے ان خالی کارتوسوں سے رزیڈنٹ اور رزیڈنسی کو اڑانے کی کوشش
کی جن کو کہ پولیس نے نہایت چالاکی سے اس کی جیب میں رکھ دیا تھا - یہ مقدمہ ہفتوں چلایا
گیا - لیکن اس کا نتیجہ بہت مایوس کُن نکلا اور رزیڈنسی کا اڑایا جانا ثابت نہ ہو سکا -
جواد حسین پر یہ مقدمہ جو کہ ایک عرصہ تک حیدرآباد میں ضرب المثل رہا اس غرض سے
چلایا گیا تھا کہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ سر آسمان جاہ اپنے سکرٹری مہدی علی کے ذریعہ
سے ملزم کی امداد کر رہے تھے لیکن مسٹر بلوڈن کی یہ چال چھپی ہوئی نہ رہ سکی
مگر اس مقدمہ کے ختم ہونے سے قبل مسٹر بلوڈن کا مدعا ایک اور طریقہ سے حاصل ہو گیا
اور اس طرح کہ اُنھوں نے ایک لاکھ روپیہ کے رشوت کے واقعہ کو اس قدر زبردست
بنا دیا کہ ہز ہائنس سر آسمان جاہ اور مہدی علی کو علٰحدہ کرنے پر مجبور ہوئے -



نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی
سید مهدي علي خان منیر نواز جنگ
(حیدر آباد سروس کے زمانہ میں)

قومی خدمات

(۱) تعلیمی

سرسید سے ملاقات اور رشتۂ اتحاد | نواب صاحب کی قومی خدمات کا سلسلہ ۱۸۶۲ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ وہ سرسید کے زمرۂ رفقا میں داخل ہوئے۔

ابتدا میں سرسید کے مذہبی عقائد سے ان کو شدید اختلاف تھا اور جب سرسید نے تبیین الکلام[۱] یعنی توریت اور انجیل کی تفسیر لکھی ہے تو اُس کے سخت ترین معترضین میں تھے اور نہ صرف معاملات مذہب میں وہ مخالف و معترض تھے بلکہ قومی خیالات اور ارادوں کو بھی وہ ناقابلِ التفات سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود اپنے ایک خط (موسومہ سرسید) میں اپنی اور سرسید کی ابتدائی ملاقات، اختلاف رائے اور سرسید کے اثر کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:۔

"مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب میں پہلے پہل آپ سے علی گڑھ میں ملا تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی نسبت آپ کے خیالات اور ارادوں پر بحث ہوئی تھی، آج اس دن کو قریب قریب پچیس برس ہونے آتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس زمانہ میں میں آپ کا مخالف تھا اور اس تعلیم کے معاملہ میں آپ کے ارادوں کی بلند پروازیاں سُن سُن کر بہت ہنستا تھا اس وجہ سے کہ مجھے معلوم تھا کہ جس قوم کی بھبودی اور ترقی کے لئے آپ فکر کر رہے ہیں وہ سُستی اور لاپروائی کی مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔

اُس وقت میرا دل یہی کہتا تھا کہ آپ کو ہرگز کامیابی نہ ہو سکے گی، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ آپ کے مذہبی عقائد کو ہندوستان کے اکثر مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے

---

[۱] حیاتِ جاوید صفحہ ۲۶۰۔

خلاف سمجھتے تھے، مگر چند ہی عرصہ میں میرے ان خیالات میں تغیر پیدا ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کا دل سچے جوش اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ میرے اعتراضات رفع ہوئے اور میرے دل نے قبول کر لیا کہ آپ کی رائے صحیح اور میرے خیالات غلط ہیں۔ اس کے بعد میرا دل خود بخود آپ کی طرف مائل ہو گیا اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں آپ کی مدد کروں گا۔"

نواب صاحب نے اس وعدہ کو جس طرح پورا کیا شاید ہی ایفائے عہد کی دنیا میں ایسی مثال مل سکے۔

سائنٹفک سوسائٹی کی ممبری

۱۸۶۴ء میں نواب صاحب سائنٹفک سوسائٹی[1] کے ممبر منتخب ہوئے اور انہوں نے سر سید کے مشن کا کام شروع کر دیا جب سر سید لندن میں تھے تو اُن کو نواب صاحب ہی پر بھروسہ تھا کہ وہ اس کام کو جاری[2] رکھیں گے۔

خطباتِ احمدیہ کی تالیف میں امداد

جب لندن میں سر سید نے خطباتِ احمدیہ[3] کی تالیف شروع کی تو نواب صاحب تفاسیر و احادیث اور اکابر علما کی مولفات و مصنّفات سے مواد[4] بھیجتے رہتے تھے اور اس کی چھپائی کے لئے اپنے پاس سے اور دوستوں سے بھی وصول کر کے چندہ روانہ کرتے تھے۔

تہذیب الاخلاق میں مضمون نگاری

لندن سے واپس آ کر سر سید نے دسمبر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری کیا جو پہلی بار پورے چھ برس تک نکلتا رہا اس میں سر سید کے سوا مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک بھی بڑے سرگرم مضمون نگار تھے۔ سر سید کے مضامین مذہبی، اخلاقی اور تمدنی ہوتے تھے مگر ان

---

[1] ۱۸۶۲ء میں سر سید نے یہ سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ قدیم مصنفین کی عمدہ اور انگریزی کی مفید کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے یہ سوسائٹی ابتداً غازی پور میں قائم ہوئی تھی۔ پھر علی گڑھ میں منتقل ہوئی اس کی عمارت بھی تیار ہوئی اور ابھی تک سوسائٹی کے نام سے موسوم ہے۔

[2] صفحہ ۲۹ مجموعۂ خطوط سر سید۔

[3] سر سید کی مذہبی تصانیف میں بڑی بلند مرتبہ کتاب ہے انگریزی میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

[4] ملاحظہ ہو مجموعۂ خطوط سر سید بنام نواب محسن الملک۔

دونوں بزرگوں کے مضامین اکثر مذہبی ہوا کرتے تھے سرسید کے مضامین مجتہدانہ اور مولوی چراغ علی کے عالمانہ ہوتے تھے مگر نواب محسن الملک جو کچھ لکھتے تھے اُس میں ایسی لطافت ہوتی تھی کہ لوگ ان کے مضامین کو پڑھ پڑھ کر سر دُھنتے تھے سرسید پر جو لوگ نکتہ چینی کرتے تھے ان کے جواب وہ ایسی دلربا ظرافت اور فصاحت سے دیتے تھے کہ سرسید کے حریف دنگ رہ جاتے تھے اور اُن سے کوئی معقول جواب بن نہیں پڑتا تھا۔

مضامین کا اثر ان مضامین کی وجہ سے متعصب علماء نے جہاں سرسید پر تکفیر کے فتاوے لکھے وہاں ان کے خاص دوستوں نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو بھی حواری اور ملحد کے خطابات دئے گئے۔ سرسید نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"اب ہمارے محبوب مہدی علی خاں اور ہمارے عزیز مشتاق حسین کا ایک حال سنو یہ ہمارے دونوں دوست ایسے ہیں جن کا حال کچھ چھپا نہیں ہے مولوی مہدی علی خاں کا علم اس کی ذاتی خوبیاں اس کی پیاری پیاری باتیں اس کی سچی ایمانداری اس کی فصیح تقریر اس قابل ہیں کہ اگر ہماری قوم کے دل کی آنکھیں اندھی نہ ہوتیں تو اس کے نام پر فخر کیا کرتے منشی مشتاق حسین کی ذاتی نیکی اور نہایت سخت دینداری، بے ریا عبادت، سچی خدا پرستی غایت تشدد سے نماز روزہ اور احکام شریعت کی پابندی جو درحقیقت بے مثل ہے، اس لائق تھی کہ اگر ہماری قوم پر خدا کی خفگی نہ ہوتی تو اس سے مسلمانی کو فخر سمجھتے مگر خدا نے ایسا اپنا غضب ہماری قوم پر نازل کیا ہے کہ ایک رائے یا ایک مسئلہ یا ایک آبائی رسم و رواج کے اختلاف کے سبب ایک کو نہایت حقارت سے حواری جس سے اشارہ عیسائی کا رکھا ہے اور دوسرے کو ملحد کا خطاب دیا ہے کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔ مگر ہمارے ان دونوں دوستوں کو خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ ان کو بعوض سچائی اور دینداری کے یہ خطاب انہی کی قوم سے ملے ہیں جن کی وہ بہتری چاہتے ہیں۔

نیک باشی و بدت گو یند خلق — بہ کہ بد باشی و نیکت گویند

کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کا جواب

۱۸۷۰ء کے اواخر میں سر سید نے مسلمانوں کی ترقی تعلیم پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنام "کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان" بنارس میں قائم کی اور جب اس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا ہے تو نواب صاحب بھی بنارس گئے تھے اس کمیٹی کا یہ کام تھا کہ

"جہاں تک ہوسکے وہ اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں، مسلمان طالب علم کس لئے کم پڑھتے ہیں، علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے، اور جب یہ تمام موانع ٹھیک ٹھیک دریافت ہوجائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور ان تدبیروں پر عمل کرے۔"

اس کمیٹی نے ایک اشتہار جاری کرکے تمام مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ اس مسئلہ پر مضامین لکھیں اور بہترین مضمون نگاروں کے لئے تین انعام پانسو اور تین سو اور ڈیڑھ سو روپیہ کے مقرر ہوئے چنانچہ بتیس ۳۲ اصحاب نے ایسے مضامین لکھے۔ نواب محسن الملکؒ نے بھی ایک رسالہ "انشراحاتِ ندویہ" کے نام سے تحریر کیا جس کو سب کمیٹی نے جو ان رسالوں کی جانچ کے لئے مقرر کی گئی تھی اول نمبر پر منتخب کیا۔

انعام سے انکار

مگر نواب محسن الملک کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا۔

علی گڑھ میں ایک کالج کی تجویز کمیٹی خزنیۃ البضاعت کی ممبری اور فراہمی چندہ

ان رسالوں کے موصول ہونے کے بعد سر سید اور ان کے رفقاء نے ایک کالج قائم کرنے کی تجویز کی اور اس کے لئے ایک کمیٹی موسوم خزنیۃ البضاعت لتاسیس مدرسۃ العلوم" کے نام سے قائم کی۔

اس کمیٹی نے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کیا جس کے ایک رکن نواب محسن الملک بھی تھے انہوں نے مرزا پور میں ایک عام جلسہ کرکے نہایت زبردست تقریر کی اور ایک سب کمیٹی مقرر کرائی جس کے ذریعہ سے معقول چندہ فراہم ہوا۔

کالج کی مالی امداد اور سر سید پر اس کا اثر

قبل اس کے کہ علی گڑھ میں باضابطہ طور پر مدرسہ قائم ہو نواب صاحب کا تقرر حیدرآباد میں ہوگیا اس لئے وہ ان ابتدائی مراحل میں کام نہ کرسکے

تاہم باوجود اس سخت انہماک کے جو حیدرآباد میں جاکر اپنے عہدہ کی خدمات میں تھا، سرسید کی امداد کا خیال ایک منٹ کے لئے بھی دل سے دور نہیں ہوا اور مدرسہ کی مالی و اخلاقی مدد کرتے رہے۔ ۱۸۷۹ء میں جب کہ تعمیر عمارت کے لئے روپیہ کی اشد ضرورت تھی اس وقت نہ صرف اپنے پاس سے چندہ دیا بلکہ کمیٹی کے لئے اپنی ذاتی ذمہ داری پر قرض لیا۔ سرسید نے اس کے متعلق اس وقت اخبار میں حسب ذیل نوٹ شائع کیا تھا:

سرسید کا نوٹ | کیا کوئی شخص اس محبت و امداد کا جو ہمارے دوست ہمارے ساتھ کرتے ہیں اندازہ کرسکتا ہے۔ مہدی علی کو گو ہم نے خفگی بھی کہا ہو گر ہم کو یاد نہیں ہے کہ کوئی زمانہ ایسا گزرا ہو کہ ہمارا دل ان کی طرف سے رنجیدہ نہ رہا ہو اور جب کبھی وہ ہم سے ملے ہوں گے اور جو کچھ ہم نے ان کو کہا ہوگا اس سے ان کو بھی خوشی نہ ہوئی ہوگی اب ایسے دو دوستوں کا جن کے دل ہمیشہ رنجیدہ رہتے ہیں حال سنو:

مہدی علی کو معلوم ہوا کہ تعمیر مدرستہ العلوم میں چندہ کی دقت ہے اور میں قرض لیکر اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں اس وقت ایک ہزار روپیہ نقد اپنے پاس سے چندہ میں بھیجدیا اور چھ ہزار روپیہ خود اپنی دستاویز تحریر کرکے حیدرآباد میں قرض لیا اور مدرسہ کی تعمیر میں صرف کرنے کو بھیجدیا یہ ایک ادنیٰ حالت اُس ہمارے پیارے دوست کی ہے جس سے ہم اپنی بدنصیبی سے بجز ترش روئی کے اور کسی طرح بات نہیں کرتے۔ افسوس ہے کہ مہدی علی نے تو ایسی محبت اور فیاضی اور دریا دلی کا کام فرمایا اور گو امید ہے کہ یہ قرضہ کمیٹی مدرستہ العلوم ادا کرے گی مگر اس کے صلہ میں اُس عزیز نے بجز خفگی کے کہ "کیوں قرض لیا اور کیوں اپنی ذمہ داری کی اور کیوں اپنے سر بوجھ ڈالا" اور کچھ نہیں سنا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس وقت ایسی مدد ہوئی ہے جس کا شکر کسی طرح ادا نہیں ہوسکتا۔ افسوس ان لوگوں پر جن پر چندہ موعودہ باقی ہے اور نہیں دیتے جیسا ہمارا دل مہدی علی سے رنجیدہ ہوتا ہے ویسے ہی ہم سچے دل سے خدا سے اس کی عمر و دولت و اقبال کی ترقی کی دعا بھی کرتے ہیں۔ حیدرآباد میں بلا اجازت وہ قرضہ نہیں لے سکتے تھے ہز ایکسلنسی

سرسالار جنگ بہادر نے صرف اس وجہ سے کہ مدرسۃ العلوم کی تعمیر کے لئے بھیجنے کو لیا جاتا ہے
قرضہ لینے کی اجازت دی پس سب سے بڑا احسان اور دلی شکر اُس توجہ کا ادا کرنا چاہیے جو حضور
سرسالار جنگ بہادر کی نسبت مدرسۃ العلوم ثابت ہوتی ہے۔"

نواب صاحب کے عطیات کی شکرگزاری | جو مالی امداد نواب صاحب وقتاً فوقتاً کالج کو دیتے رہے ان کا سرسید کے دل پر خاص اثر ہوا اور اگرچہ نواب صاحب کسی شکرگزاری کے متمنّی نہ تھے لیکن سرسید نے اظہار شکرگزاری کے لئے ایک عمارت مہدی منزل کے نام سے موسوم کی اور حسب ذیل نوٹ شائع کیا:

مہدی منزل | اگرچہ ممبران کمیٹی مدرسۃ العلوم اُن تمام بزرگوں کی جنہوں نے قومی ہمدردی سے مدرسۃ العلوم کی اعانت و امداد کی ہے دل سے شکرگزار رہے مگر اس نے اپنا فرض سمجھا ہے کہ اُن میں سے ان بزرگوں کی جنہوں نے اس کے قیام میں بے انتہا ہمت صرف کی ہے اور اپنے مال سے اور اپنی سعی سے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا خاص طور سے شکرگزاری کی جاوے اگرچہ ہر ایک بزرگ کی فیاضی فرداً فرداً علت تامّہ اس مدرسۃ العلوم کے قیام کی متصور ہے مگر بعض کی سعی اور فیاضی ایسی ہے جن کے شکریہ کی دائمی یادگار کا قائم ہونا ہماری کمیٹی کو ذریعۂ افتخار متصور ہے۔ ان بزرگوں میں سے ایک جناب سید مہدی علی خاں رئیس اٹاوہ معتمد مدار المہام صیغۂ مال گزاری سرکار عالی حیدرآباد نظام ہیں، انہوں نے اپنی ذات سے بے انتہا فیاضی اور اپنے قلم و قدم سے بے نظیر امداد اس مدرسہ کی کی ہے اس لئے ممبران کمیٹی مدرسۃ العلوم نے یہ تجویز کی ہے کہ علاوہ ان عمارتوں کے جو خاص ان کے زرِ عطیہ سے تعمیر ہوئی ہیں اور جن پر ان کے نام نامی کے کتبے لگائے جاویں گے وہ عمارت جو نہایت عمارت انگلش کلاسوں اور لٹن لائبریری کے واقع ہے اور جس کی تعمیر نہایت سرگرمی سے ہو رہی ہے کمیٹی کی جانب سے بطور اظہار شکرگزاری و یادگاری فیاضی جناب ممدوح کی ان کے نام سے موسوم کی جاوے اور آئندہ سے اُس عمارت کا مہدی منزل نام ہو اور ایک کتبہ جو

اُس پر لگانا تجویز ہوا ہے بجنسہٖ اس کو ہم اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں۔

کتبہ | ممبران کمیٹی ہائے مدرسۃ العلوم کہ در قیام این مدرسہ صرف ہمت نمودہ اند بہ شکر گذاری گلِ سرسید این گلستان و شجر بارور این اعنی جناب مولوی سید مہدی علی خاں رئیس اٹاوہ رطب اللسان و عذب البیان بودہ اند۔ الحق سعی ہائے بے عدیل و فیاضی ہائے جمیل شان در قالب آن انداختہ اند ذریعۂ قیام و استحکام آن بودہ است پس ممبران کمیٹی ہائے مذکورہ بہ اظہار شکر گزاری و یادگار فیاضی جناب ممدوح این لوح را درین منزل نصب می نمایند و این منزل را بنام نامی جناب ممدوح می سازند۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و انا العبد المفتقر الی اللہ الصمد سید احمد۔

گورنمنٹ نظام اور سرسالار جنگ سے امداد مقرر کرانا

علاوہ ذاتی امداد کے سرسالار جنگ سکرٹیری کمیٹی ہائے مدرسۃ العلوم کو توجہ دلاکر ریاست سے بھی گرانٹ ان ایڈ مقرر کرائی۔ ان ہی کا اثر تھا کہ ۱۸۸۴ء میں سرسالار جنگ نے کالج کا معائنہ کیا اور اپنی جاگیر سے بھی سالانہ امداد منظور کی۔

۱۸۹۳ء میں حیدرآباد سے آکر اجلاس کانفرنس منعقدہ علی گڑھ کی صدارت کی اور ایک معرکۃ الآرا خطبۂ صدارت پڑھا۔

غرض جب تک حیدرآباد میں رہے کالج کو نفع پہنچانے میں کسی موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

حیدرآباد سے واپسی اور قومی خدمات میں انہماک

۱۸۹۳ء میں جب وظیفہ یاب ہو کر آئے تو انہوں نے اپنی بقیہ زندگی کو قومی تعلیم، کالج کی ترقی، اور مسلمانوں کے سود و بہبود کے لئے وقف کر دیا اور مستقل طور پر علی گڑھ میں رہنے کا عزم کر لیا۔ لیکن بدقسمتی سے سرسید کا آخری زمانہ ایک سخت تلاطم اور ہیجان کا تھا اور مسلمانوں کی یہ کشتی تعلیم (کالج) اپنے ناخدا کی ضد یا بقول مولانا حالی اپنی رائے پر وثوق کے باعث طوفانی موجوں میں گھر گئی تھی خصوصاً ایک لاکھ کا غبن تو ایسا سخت تھپیڑا تھا جس سے کشتی کے غرق ہو جانے کا ہی خطرہ ہو گیا تھا۔ ٹرسٹیوں کی بے توجہی کی یہ نوبت تھی کہ کورم جس میں سات ممبروں کے اجتماع کی ضرورت تھی پورا نہ ہوتا تھا چنانچہ ۱۸۹۶ء

کے سالانہ اجلاس میں کل (۵) ٹرسٹی شریک تھے۔

سرسید سے اختلاف اور بمبئی کا قیام نواب صاحب نے ہرچند اصلاح کی کوشش کی لیکن سرسید پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سرسید کو ان کی طرف سے ایک قسم کی بدگمانی پیدا کرادی گئی اور بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سرسید اس بات کے بھی روادار نہیں رہے تھے کہ محسن الملک علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی قدم رکھیں، ممکن ہے کہ اس روایت میں مبالغہ ہو لیکن یہ یقینی ہے اور اس زمانہ کے کاغذات دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کو سرسید کے طریق کارروائی پر بہت اعتراض تھا اور ان کی کچھ پیش نہ جاتی تھی اس حالت کے متعلق نواب وقار الملک کو انہوں نے متعدد خطوط لکھے ہیں جن سے کالج کی انتظامی خرابیوں اور اصلاح سے مایوسیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ باوجود ان خرابیوں اور مایوسیوں کے نواب محسن الملک کا جذبہ قومی برابر کام کرتا رہا اور زیادہ تر صوبہ بمبئی کو جہاں سال کا زیادہ حصہ بسر کرتے تھے اپنا محور عمل قرار دے لیا۔

بمبئی میں مقاصد کالج کی تبلیغ بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب کو کالج کی طرف متوجہ کرنے میں انہوں نے انتہائی کوششیں کیں۔

اس وقت تک بجز خاندانِ ناخدا کے سربرآوردہ رکن (مرحوم) محمد علی روغے کے اور کسی کو کالج کی طرف توجہ نہ تھی بلکہ آنریبل مسٹر جسٹس بدرالدین طیب جی کا تو کسی حد تک علی گڑھ کے مخالفین میں شمار تھا لیکن نواب صاحب نے ہر ایک شخص سے جس سے ذرا بھی قومی مقاصد میں امداد کی توقع تھی ربط ضبط بڑھایا اسلام کلب اور انجمن اسلام میں متعدد بار نہایت دلچسپ اور مؤثر تقریریں کیں ان کے علاوہ اور جو مواقع ملے ان سے فائدہ اٹھایا اور اپنی اعجاز بیانی سے بڑے بڑے لوگوں کے دل رام کر لئے۔

ہز ہائی نس آغا خاں کو متاثر کرنا جن میں سے سب سے عظیم شخصیت ہز ہائی نس آغا خاں کی ہے

۱؎ مکاتیب حصہ اول خطوط موسومہ نواب وقار الملک۔

اگرچہ ہز ہائی نس کو پہلے سے علی گڑھ کے ساتھ ہمدردی تھی لیکن ان کے دل میں جو لگن پیدا ہوئی اور جس نے ان سے علی گڑھ کی ترقی اور عظمت کے کام کرائے وہ صرف نواب محسن الملک کی ہی لگائی ہوئی تھی۔

اخبارات کا اجرا مجامع عام کی تقریروں اور پرائیوٹ طور پر اثر ڈالنے کے علاوہ نواب صاحب نے عام مسلمانوں میں علی گڑھ کے مقاصد کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے اور قومی تعلیم پر متوجہ ہونے کے لئے ایک اور موثر تدبیر بھی اختیار کی یعنی آنریبل بدرالدین طیب جی اور بعض دیگر ممتاز اصحاب کو ایک قومی اخبار جاری کرنے کا مشورہ دیا اور ان اصحاب نے مشترکہ سرمایہ سے گجراتی وانگریزی میں مانیٹر اور اردو میں مرأۃ الاخبار نواب صاحب کی ذمہ داری پر جاری کیا۔ اور عام انتظامات وغیرہ کے لئے ایک بورڈ بنا دیا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد بورڈ نے اخبار بند کر دیا مگر نواب صاحب نے فوراً ہی اپنے پاس سے روپیہ صرف کر کے دوسرا اخبار "سفیر بمبئی" کے نام سے جاری کرا دیا[۵]۔

اخبارات کا اثر اگرچہ ان اخبارات کی زندگی بہت تھوڑے دن رہی لیکن نواب صاحب نے مسلمانان بمبئی کے دلوں میں علی گڑھ اور اس کے مقاصد وتحریکات فوائد کو اچھی طرح راسخ کر دیا اور حقیقت یہ ہے کہ بمبئی کے اسلامی حلقوں میں ایک تموج پیدا ہو گیا اور تمام مختلف العقائد مسلمانوں کو کنی، میمن، خوجے سلیمانی اور داؤدی، بوہرے سب میں نواب صاحب نے ایک قسم کی قومی زندگی پیدا کر دی ان کے ان مساعی کا اندازہ اُن ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو اس وقت ان کے ساتھ تھے اور جنہوں نے شب و روز اُن کے انہماک کو دیکھا ہے۔

---

[۵] مؤلف سوانح اس زمانہ میں بمبئی میں اخبار مسلم ہیرلڈ کا اسسٹنٹ اڈیٹر تھا نواب صاحب کے پاس بھی کام کرتا تھا جو علی العموم کسی ترجمہ یا مضمون کا مسودہ یا مبیضہ ہوتا تھا اکثر نواب صاحب پلنگ پر لیٹ کر یا آرام کرسی پر بیٹھ کر مضمون بولتے جاتے تھے اور میں لکھا کرتا تھا، مضامین اکثر اڈیٹوریل ہوتے تھے کبھی میرے مضامین پر اصلاح فرماتے تھے مرأۃ الاخبار میں مجھے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر کرا دیا تھا پھر سفیر کا اڈیٹر بنایا۔ مگر نواب صاحب کے علی گڑھ آجانے اور طاعون کی شدت کے باعث میں نے بھی بمبئی چھوڑ دیا اور اخبار بھی دوسرے ہاتھوں میں چلا گیا جو چند دن کے ......

بمبئی سے واپسی اور محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے مفید بنانے کی مساعی

جب کالج میں غبن ہوا اور کالج کا تقریباً دیوالہ نکل گیا تو پھر نواب صاحب سے ضبط نہ ہو سکا اور علی گڑھ آکر انہوں نے محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی آبیاری اور نشو و نما میں اپنی ساری قوت و ہمت منعطف کر دی کیونکہ یہی ایک ذریعہ کالج کو تقویت دینے اور اس غبن کے نقصان کی تلافی اور اس بد دلی کو جو انتظامات کالج کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی دور کرنے کا تھا۔

وہ ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۶ء کے اجلاس ہائے منعقدہ علی گڑھ و شاہجہاں پور کے پریسیڈنٹ بھی منتخب ہوئے تھے اور نہایت معرکۃ الآرا تقریریں کی تھیں اور انہوں نے تین اجلاسوں کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ کر لیا کہ اس کے باقاعدہ اجلاسوں اور قابل قابل لوگوں کی تقریروں اور مباحث سے قوم کے دلوں میں تعلیم کا شوق اور قومی خدمت کا ولولہ اور اپنی حالت کا احساس پیدا ہو جائے گا۔

کانفرنس کے متعلق ایک گشتی خط

چنانچہ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے سر سید کو ایک طولانی خط لکھا جس میں کانفرنس کے تنزل کے اسباب اور ترقی کے ذرائع پر مدلل بحث کی اور ایسی تدابیر جن پر بہ آسانی عمل ہو سکے پیش کیں اس خط کو پمفلٹ کے طور پر چھپوا کر اور قومی اخبارات کے ذریعہ سے تمام ملک میں شائع کرایا۔

دورے

میرٹھ، دہلی، مظفر نگر، سہارنپور، رام پور، مراد آباد کا دورہ کیا، ہر جگہ جلسے منعقد کرائے تقریریں کیں، پرائیوٹ ملاقاتوں میں سربرآوردہ لوگوں پر اثر ڈالا۔

لطیفہ

اسی دورہ میں بمقام دہلی ٹون ہال میں عمائدین شہر نے بڑے اہتمام کے ساتھ ایک جلسہ منعقد کیا اور تاریخ جلسہ سے پہلے عام اطلاع کے لئے بہ کثرت اعلان شائع کئے، ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا اور ٹون ہال کے اندر باہر تل رکھنے کو جگہ نہ تھی مولوی صاحبان نے حسب معمول مخالفت شروع کر دی اور عین جلسہ کے دن ٹون ہال کے دروازہ پر چند مولوی صاحبان

بھی تشریف لائے اور سرسید کی نیچریت اور کفر و الحاد پر وعظ شروع کر دیا اس وعظ میں یہاں تک کہہ دیا کہ:

"اس کمرہ میں لکچر سننے کے لئے جانا سیدھا جہنم میں جانا ہے، لکچر سننے والوں پر ان کی منکوحہ عورتیں حرام ہو جائیں گی"۔

ایک مولوی صاحب نے یہ فقرہ بھی کہا کہ:

"وہاں نہ جاؤ وہاں تو "دجال" آیا ہے"۔

نواب صاحب کو بھی اس فقرہ کی اطلاع ہو گئی انہوں نے اپنی تقریر کی تمہید میں کہا کہ:

"مولوی صاحبان کا یہ کہنا کہ دجّال آیا ہے ایسا خلاف واقع امر ہے کہ کوئی شخص اس کا یقین نہیں کرے گا ایک بچّہ سے بھی پوچھو گے تو یہی کہے گا کہ مہدی آیا ہے"۔

مدرسہ مظاہر الاسلام کی طرف سے دعوت و تہنیت نامہ

اس دورہ کے سلسلہ میں بماہ دسمبر جب نواب صاحب میرٹھ پہنچے تو مدرسہ مظاہر الاسلام کی طرف سے جلسہ تقسیم انعام میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی جو ان ہی دنوں میں ہونے والا تھا۔ اس مدرسہ کے قیام کو اس وقت ۳۰ سال گذر چکے تھے اور ۲۰۶ طلباء نے سندِ فضیلت حاصل کی تھی۔ جب ہم اس مخالفت کا خیال کرتے ہیں جو طبقہ علماء میں سرسید کے عقائد ان کے مشن اور ان کے رفقاء کے ساتھ تھی تو حقیقت میں یہ دعوت ایک کرامت معلوم ہوتی ہے۔ نواب صاحب نے بڑی خوشی سے دعوت قبول کی۔ اور سہارنپور تشریف لے گئے جلسہ میں علاوہ علماء سہارنپور کے علمائے دیوبند بھی تھے۔ نواب صاحب کا نہایت خلوص کے ساتھ استقبال کیا گیا اور جلسہ کے صدر قرار پائے ارکانِ مدرسہ نے ایک تہنیت نامہ پیش کیا جس میں نواب صاحب کے پُرجوش خیر مقدم اور مدرسہ کے حالاتِ تعلیم و طلبا بیان کرنے کے بعد اس غلط فہمی کی کہ "ارباب مدارس اسلامیہ انگریزی تعلیم کو برا سمجھتے ہیں"۔ نہایت زور کے ساتھ تردید کی۔

رامپور میں ہزہائی نس سے ملاقات

اسی دورہ میں نواب محسن الملک رام پور بھی گئے جہاں ہزہائینس

نواب صاحب فرمانروائے رام پور نے مدعو کیا تھا۔

ہز ہائی نس نے شاہانہ اخلاق کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور ایک دن مسلسل پانچ گھنٹہ قومی ضروریات و مسائل پر گفتگو رہی پھر رام پور کلب میں نواب صاحب نے ہز ہائی نس کی موجودگی میں قومی تعلیم پر ایک پُرزور تقریر کی۔

رام پور سے مراد آباد آئے جہاں عمائدین شہر نے پُرجوش استقبال کیا اور جلوس نکالا۔ ایک عظیم الشان جلسہ نواب صاحب کی تقریر سننے کے لئے منعقد ہوا۔ اسی سلسلہ میں آرہ بھی گئے اور مجلس مذاکرۂ علمیہ میں لکچر دیا۔

غرض اس دورہ نے ایک عام بیداری پیدا کردی اور اب ہر طرف کالج کانفرنس اور تعلیم ہی کا مضمون زیر بحث تھا چنانچہ اس کے بعد دسمبر میں بمقام میرٹھ کانفرنس کا عظیم الشان اور نہایت کامیاب اجلاس منعقد ہوا۔

سرسید کا آخری زمانہ اور انتظامی اختلافات

لیکن ۱۸۹۷ء میں کہیں اجلاس منعقد نہ ہوسکا اور نواب محسن الملک کی ان کوششوں میں ایک قسم کی رکاوٹ پیدا ہوگئی۔

ادھر انتظامات کالج میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی اور سرسید ہر ایک صلاح و مشورہ کو جو ان کی رائے کے خلاف ہوتا غصہ اور حقارت کے ساتھ مسترد کردیتے تھے، وہ تمام و کمال مسٹر بیک اور یوروپین اسٹاف کے ہاتھ میں تھے نواب محسن الملک باوجودیکہ ہر ایک ایسی بات سے جو سرسید کی ذرا سی کبیدگی کا باعث ہو احتراز کرتے تھے لیکن وہ اس نازک حالت میں نواب وقار الملک اور مولانا حالی کے ساتھ متفق ہوگئے کہ ٹرسٹیوں کے پاس اس مضمون کی ایک یادداشت بھیجی جائے کہ کالج کی خبر لیں اور اس کو یوروپین اسٹاف کے ہاتھوں میں چلے جانے سے روکیں۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ایک ایسی ہی یادداشت اخبارات میں شائع کرنے کے لئے بھی بھیجدی گئی تھی لیکن سرسید کی سخت علالت اور پھر انتقال کے سبب سے اس کی اشاعت روک دی گئی اور یہ دوسری والی یادداشت بھی ملتوی ہوگئی۔

سرسید کا انتقال اور نزاکتِ حالات سرسید کی وفات کالج ہی کے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے ایک مصیبت کبریٰ تھی اس پر انتظامات کی خرابی اور مالی حالت کی کمزوری نے دلوں میں مایوسیاں پیدا کردی تھیں سید محمود (مرحوم) اپنے باپ کے جانشیں ہوگئے تھے لیکن ان میں مشکلات کے مقابلہ کی طاقت نہ رہی تھی۔ اس مالی حالت کا کچھ اندازہ اس ایڈریس سے ہوتا ہی جو سرسید میموریل فنڈ کمیٹی نے ہزآنر سر جمیس لاٹوش لفٹنٹ گورنر و پیٹرن کالج کو دیا تھا جس میں بیان کیا گیا تھا کہ:

کالج کی مالی حالت "کالج کی موجودہ حالت کا موازنہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس حالت پر اس کالج کو سرسید مرحوم نے اپنے آخری پانچ سال میں پہنچا دیا تھا اس حالت پر بھی اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے تاوقتیکہ ایک بڑی رقم روپیہ کی اس کے کیپٹل فنڈ میں اضافہ نہ کی جائے سرسید کی وفات کے وقت کالج کے ذمہ تقریباً پچاس ہزار روپیہ قرض تھا اور اس قرض کی بدولت ایک بڑی رقم سود کی اس وقت دینی پڑتی ہے اس کے علاوہ کالج کے ذمہ تقریباً تیرہ ہزار روپیہ کا ایک اور قرض ہے اور باوجودیکہ ایک یوروپین پروفیسر کی جگہ کالج میں خالی ہے تاہم ماہواری اخراجات اس وقت آمدنی سے قریب تین سو روپیہ کے زیادہ ہیں اور باوجودیکہ نہایت کفایت شعاری سے یہ زیادتی کم کی گئی مگر اب بھی کالج اس قابل نہیں ہوا کہ ایک یوروپین پروفیسر کو بلا سکے یا اُس قرضہ کو ادا کرسکے جو اس کے ذمہ روزمرہ کے اخراجات کی وجہ سے عائد ہوتا جاتا ہے اس قرضہ کو ہم صرف اپنی آمدنی کی بچت ہی سے ادا کرسکتے ہیں جب تک کالج کو کچھ روپیہ نہ مل سکے اُس کی حالت صرف ایسی ہی خراب رہے گی جیسی کہ اب ہے بلکہ اُس کو مجبوراً اپنے اُس درجہ سے تنزل قبول کرنا پڑے گا جو اُس نے سرسید کی آخری عمر میں حاصل کرلیا تھا۔"

اس کے علاوہ پرنسپل نے اپنی رپورٹ میں ان قرضوں کے متعلق لکھا تھا کہ:۔

"اس وقت درجنوں آدمیوں کا اسٹاف کے ممبروں کی تنخواہیں، معماروں، باغبانوں مزدوروں کتب فروشوں، ڈبیچر کے خریداروں کا روپیہ ادا کرنا تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ان کی فہرست

کبھی ختم نہ ہوگی۔ ہر روز ان قرض خواہوں کا کالج میں ہجوم رہتا تھا یا وہ غضب ناک خطوط
تحریر کرتے تھے۔

عام خرابی پر سر انٹونی میکڈانلڈ کا ریمارک

بے اعتمادی اور خرابی انتظام کے متعلق اسی زمانہ میں ہز آنر
سر انٹونی میکڈانلڈ نے کالج وزٹ کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا:-

"اس موقع پر یہ ضروری نہیں ہے کہ میں مالی جزئیات کی تفصیل کروں مگر میں اسی قدر
کہہ سکتا ہوں کہ زرِ دادنی کی ایک معقول رقم ہے تاہم اگر ٹرسٹی باہمی اتفاق سے اور
معقول اعتدال اور استقلال کے ساتھ ٹھیک کوشش کریں تو اس کا بیباق
کردینا چنداں دشوار نہیں مگر اس موقع پر اس بات کا پوشیدہ رکھنا محض بے سود ہوگا کہ
ٹرسٹیوں میں اتفاق نہیں ہے اور میں اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں کہ بعض لوگوں
میں اعتدال بھی نہیں جس کی وجہ سے ان اصول پر جو اسی کے بانی نے قائم کئے تھے کالج
کا وجود ہی مخدوش حالت میں ہو گیا ہے اور اس ہی حالت کی وجہ سے پبلک کے دلوں
میں قدرتی طور سے اس انسٹی ٹیوشن کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔

میں نے اپنا دورہ روہیل کھنڈ اور میرٹھ ڈویژن میں جہاں بہت سے قدیم مسلمان
خاندانوں کے وطن ہیں خاص کر اسی غرض سے کیا کہ اس بارہ میں مسلمانوں کے خیالات
معلوم کروں اور میں اپنی اس تحقیقات کے نتیجہ سے مطمئن ہوں کہ لوگوں کو یقین ہے کہ
موجودہ انتظام اور بندوبست کا سسٹم (طریقہ) کافی اور قابل اطمینان نہیں جس کی وجہ
سے اب تک ایسی ضرورت کے وقت میں بھی وہ کالج کی پوری پوری مدد کر دینے سے ہاتھ
کھینچے ہوئے ہیں یہ خیال اس وقت پیدا ہوا تھا جب کہ ۱۸۹۵ء کا غبن لوگوں پر ظاہر ہوا
اور جتنے سال گزرتے گئے اتنا ہی یہ خیال بھی پختہ ہوتا گیا کیونکہ جس انتظام کی خرابی یعنی
ایک شخص کے ہاتھ میں کل انتظام ہونے کی وجہ سے اس غبن کا ہونا ممکن ہوا اس کی
کوئی اصلاح نہ کی گئی میں یقین کرتا ہوں کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بالاتفاق یہ رائے ہے کہ قبل

اس کے کہ کالج کی طرف سے لوگوں کو پورا پورا اعتماد اور اطمینان ہو۔ یہ امر نہایت لازمی ہے کہ اس کے انتظام میں بعض ضروری تغیرات عمل میں آئیں۔"

نواب صاحب کی سعی ہائے مشکور اور میموریل فنڈ کمیٹی کا کام

ان حالات میں نواب محسن الملک نے اپنی تمام تر توجہ کالج کو مالی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے میں مبذول کی۔ انہوں نے بغیر کوئی لمحہ ضائع کئے سرسید میموریل فنڈ کمیٹی قائم کی اور اس کو کامیاب بنانے کی تدابیر پر عمل شروع کر دیا۔ قوم میں کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کی تحریک پیدا کی اور تمام ہندوستان میں قومی کام کرنے والوں کو ایک نظام عمل کے ماتحت لے آئے۔ بحیثیت پریسیڈنٹ سرسید میموریل فنڈ کمیٹی انہوں نے پنجاب اور صوبہ مغربی و شمالی کا دورہ کیا، جلسے ہوئے اور سب کمیٹیاں قائم کرائیں

قرضوں کی ادائی

چھ ماہ میں ایک لاکھ ~~للعہ~~ ۱۴۴۰۵ کے وعدے ہوئے اور منجملہ رقم موعودہ ۱۱۱۹۰ نقد وصول ہو گیا جس سے فوراً بنک کا قرضہ ادا کر کے سود سے مخلصی حاصل کی اور اس کے علاوہ اکثر متفرق چھوٹے قرضے ادا کر دئے۔

سید محمود سے اختلافات

لیکن ملک میں عام بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور اصلاح کی نہایت ضرورت تھی اس لئے یہ کارروائی مجبوراً رک گئی سید محمود کی حالت روز بروز سکرٹیری شپ کے ناقابل ہوتی جا رہی تھی، دوسری طرف فرقہ بندی کی بدترین شکل پیدا ہو گئی تھی، خطوط مراسلات مضامین اور پمفلٹ شائع ہوتے تھے۔ اور اس اشتباہ پر کہ نواب محسن الملک یہ چاہتے ہیں کہ مولوی سمیع اللہ خاں یا وہ خود سکرٹیری ہو جائیں سید محمود علانیہ مخالفت پر اتر آئے تھے مرزا عابد علی بیگ صاحب[1] اور سید محمد احمد صاحب[2] نے متعدد مضامین اور پمفلٹ نواب صاحب کی مخالفت میں شائع کئے جن میں نہایت سخت الفاظ میں اتہامات لگائے گئے[3]۔

۱؎ مرزا صاحب سرسید کے بڑے معاونین میں تھے۔ ۲؎ سرسید کے بھتیجے اور ریٹائرڈ سب جج۔

۳؎ ان تنازعات و اختلاف کا باعث مسٹر بیک تھے اور جیسا کہ سید محمد احمد صاحب نے لکھا تھا کہ

"اس وقت یورومین اسٹاف اپنی اصلی خدمات سے ہٹ کر باہمی تنازعات میں شامل (باقی نوٹ بر صفحہ آئندہ)

عام رائے سید محمود کی سکرٹیری شپ کی مخالف تھی اور خود یہ پارٹی بھی احساس کرتی تھی اسی بنا پر سید محمد احمد کا نام سکرٹیری شپ کے لئے باقاعدہ پیش بھی کیا گیا۔

سکرٹیری شپ پر نواب صاحب کا انتخاب

مگر کثرت رائے اور نیز گورنمنٹ کے ایماء سے ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کے اجلاس ٹرسٹیان میں جس میں پنجاب کے ممتاز اصحاب بہ کثرت شریک تھے نواب محسن الملک ٹرسٹیوں کی رائے سے سکرٹیری منتخب ہوئے اور سید محمود لائف پریسیڈنٹ کئے گئے اور ان کو بعض نہایت اہم اختیارات جو اس سے قبل سکرٹیری شپ میں حاصل تھے بحیثیت پریسیڈنٹ تفویض کئے گئے اور خاصکر یوروپین اسٹاف کا تمام تعلق ان ہی سے رکھا گیا۔

ایک دردانگیز منظر

اس فیصلہ کے بعد نواب محسن الملک کھڑے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ:-

"اس وقت مجھے مرجانا چاہئے افسوس میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ ۳۰ برس کی دوستی کے بعد سید محمود کا عہدہ مجھے ملے"

اس کے بعد جوش گریہ سے آواز گلوگیر ہوگئی اس وقت سید محمود ہال میں موجود نہ تھے۔ بعد ختم تقریر ٹرسٹی نماز کو جانے لگے سید محمود برآمدہ میں ٹہل رہے تھے۔ نواب صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ:-

"محمود سن یہ وقت ایسا ہے کہ مجھے اور تجھ کو دونوں کو مرجانا چاہیے میں ٹرسٹیوں کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرتا اگر تو مجھے سکرٹیری مقرر کرے۔ تو میں سکرٹیری مقرر ہوتا ہوں میری

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) ہو گیا تھا۔ مسٹر بیک لائف پرنسپل ہونا چاہتے تھے انہوں نے قواعد وغیرہ کے متعلق ٹرسٹیوں سے مراسلت شروع کر دی تھی اور اس میں خود ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ ان کا تمام وقت رجسٹراری اور غیر متعلقہ کاموں میں صرف ہوتا تھا ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جو کچھ اختلافات ابتدا سے پیدا ہوئے ہیں ان کے رفع نہ ہونے کے اسباب میں ایک سبب کالج اسٹاف ہی اور اب جو سید صاحب کی وفات کے بعد جھگڑے پیدا ہو گئے ہیں وہ مسٹر بیک کی دخل دہی اور اپنا ایک فریق قائم کر لینے کا نتیجہ ہی"

اور تیری ۳۰ برس کی دوستی ہے تو نے اس عرصہ میں مجھے بہت تکلیفیں دی ہیں لیکن اس پر بھی میں تیرے کہنے سے باہر نہیں ہوں۔ تیری جوتیاں اٹھانے کو موجود ہوں۔"

یہ کہکر نواب محسن الملک زمین پر گر پڑے اور سید محمود کے پیروں پر سر رگڑنے لگے۔ سید محمود نے رو کر اٹھایا اور گلے لگایا اور برآمدہ میں روتے رہے پھر دونوں نے ایک دوسرے کی پیشانی پر بوسہ دیا اور باہم دونوں بغلگیر ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ کر ملے۔ یہ منظر نہایت موثر تھا اور ہر شخص ہی نہیں بلکہ کالج کا در و دیوار متاثر نظر آ رہا تھا[۱]۔

مشکلات انتظامی

اگرچہ محسن الملک سکرٹیری ہو گئے تھے اور کوئی دقیقہ انہوں نے سید محمود کی اطاعت و فرمانبرداری کا نہیں اٹھا رکھا اور حتی الامکان یہ بھی کوشش کی کہ سید محمود کے ساتھ مل کر کام کریں اور اس کے لئے انہوں نے تکلیفیں بھی اٹھائیں لیکن سید محمود کی مخالفت اور حالتِ مزاج نے روزمرہ کے کاموں کو بھی بہ اطمینان و آسانی دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن بنا دیا تھا یوروپین اسٹاف جس کے اطمینان کے لئے سید محمود کو ۱۸۸۹ء میں ہی سکرٹیری بنا دیا گیا تھا اُن سے اس درجہ بددل تھا کہ مسٹر بیک نے ٹرسٹیوں کو نوٹس دیدیا تھا کہ:۔

"میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے محمود کے بارہ میں ٹرسٹی یا تو ان کو رکھیں گے یا مجھ کو"

بیک صاحب کے انتقال کے بعد جب مسٹر ماریسن کا پرنسپلی پر تقرر ہوا ہے تو انہوں نے بھی ان ہی

---

[۱] **ایک واقعہ گزشتہ** یہی ہال تھا اور تقریباً یہی ٹرسٹی تھے جہاں اور جن کے سامنے ۱۸۸۹ء میں سرسید نے کالج کے تاریخانہ حالات اور جدید واقعات پر ایک پُرزور لیکچر دیا تھا جس کا ایک مدعا یہ بھی تھا کہ قوم ابھی سے سید محمود کو آئندہ کے لئے لائف آنریری سکرٹیری تسلیم کرلے اور اس کو قانونی طور پر مستحکم کر دیا جائے قوم نے اس بات کو تسلیم کیا اور ٹرسٹیوں نے ۵ رائوں سے بخلاف ۲۳ رائوں کے فیصلہ کر کے قانون کے ذریعہ سے بھی مستحکم کر دیا۔ مولوی سمیع اللہ خاں جن کی کوششیں کالج کے قائم کرنے میں سنگِ بنیاد اور مسالہ تعمیر تھیں ہمیشہ کے لئے بے تعلق ہو گئے قوم میں نفاق و شقاق پھیل گیا اور عرصہ تک افسوسناک کشیدگیاں اور رنجشیں قائم رہیں آج وہ ہی سید محمود صرف ۱۰ ماہ تک اپنے عہدہ پر مقرر رہنے کے بعد ۱۵ رائوں سے معزول کئے جاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ سرسید نے جو کچھ کیا وہ مبنی بر نیک نیتی تھا لیکن آئندہ واقعات کا علم محض اسی علام الغیوب کو ہے جس کی قدرت سے واقعات رونما ہوا کرتے ہیں۔

حالات کی بنا پر اس عہدہ کی منظوری سید محمود کی معزولی پر مشروط کی۔

ایک مشکل کا حل

بہر حال سید محمود پریسیڈنٹ سے وزیٹر بنائے گئے اور اس طرح عملاً ان کی مداخلت کا خاتمہ ہو گیا اور نواب محسن الملک کام کرنے کے لئے آزاد ہو گئے۔

شکستہ جہاز کی ناخدائی

مگر نواب صاحب کی آزادی ہزار پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھی ان کو ایک ایسے جہاز کی ناخدائی ملی تھی جو مخدوش حالت میں دشوار گزار آبناؤں سے گزرنے والا تھا اور جہاں بھٹی ہوئی سرنگیں کثرت سے بچھی ہوئی تھیں۔ کالج کا نظام کار، اس کا قانونِ اساسی سرمایہ کی کمی، ٹرسٹیوں کی بے پروائی اسٹاف کی خودسری اور اس کے کمرشکن مطالبات اور گورنمنٹ کا دباؤ یہ سب ایسے خطرات تھے کہ جس سے کالج جیسے شکستہ جہاز کو نکال لے جانا تائید غیبی کے سوا ممکن نہ تھا۔

بجٹ کی کمی اور پیٹرن کی تنبیہ

اگرچہ سرسید میموریل فنڈ سے کالج کا کل قرضہ ادا ہو گیا تھا اور سنہ ۱۹۰۰ء میں گورنمنٹ نے بھی امداد میں کچھ اضافہ کر دیا تھا لیکن بجٹ میں پھر بھی تین ہزار کی کمی تھی سنہ ۱۹۰۱ء کا بجٹ جب صوبہ کے لفٹنٹ گورنر (پیٹرن کالج) کی خدمت میں بھیجا گیا تو اس پر بذریعہ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن یہ حکم موصول ہوا کہ:۔

"لفٹنٹ گورنر اور چیف کمشنر نے اس امر پر لحاظ کیا ہے کہ بجٹ مذکور میں خرچ کی زیادتی ہے اور ہز آنر کا خیال ہے کہ ایسی درسگاہ میں جس کی مالی حالت ایسی غیر مطمئن ہو اخراجات بڑھانے میں بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔"

ٹرسٹیوں کی بے توجہی

لیکن ٹرسٹیوں کی غالب تعداد نکمی تھی اور جن کی نسبت مولانا حالی مرحوم کی رائے تھی کہ:۔

"نکمے اور نالائق ٹرسٹیوں کی بھرتی درحقیقت سرسید کے وقت میں شروع ہوئی تھی انہوں نے کالج کی وقعت بڑھانے کے لئے اور نیز اس لئے کہ ان کے دور اندیشانہ منصوبے بغیر کسی اختلاف کے پورے ہوتے رہیں ایسے لوگوں کو کالج فنڈ کمیٹی کا ممبر بنایا تھا جن سے مالی امداد

کی توقع ہو یا جو قوم میں کسی وجہ سے شہرت رکھتے ہوں اور سکرٹیری سے کسی معاملہ میں ان سے اختلاف کرنے کا نہ ان میں مادّہ ہو نہ ارادہ۔ پھر جب ٹرسٹی بل پاس ہوا تو وہ ہی لوگ ٹرسٹی مقرر کئے گئے اور آج تک اسی اصول پر ٹرسٹیوں کا انتخاب ہوتا رہا۔"

ایسے ٹرسٹیوں سے کیا امید ہو سکتی تھی کہ وہ اس نازک وقت میں عزم و ہمت اور ایثار و سرگرمی سے سکرٹیری کی مدد کریں گے۔

ایسے نازک موقع پر سالانہ اجلاس بھی کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا جس کے لئے سات ٹرسٹیوں کی ضرورت تھی اور ان کا جمع ہونا بھی مشکل تھا حتیٰ کہ تار و خطوط سے بھی توجہ دلائی۔

اسٹاف کا طرزِ عمل اور اس کا تاریخی خلاصہ ان حالات میں اسٹاف کی خودسری اور غیر ہمدردانہ مطالبات نے اور بھی پریشان کر دیا تھا اور مسٹر بیک کا طریق عمل باوجود ان تمام قابل احترام ہمدردیوں کے جو انہوں نے اس کالج کی ترقی و استحکام میں اور مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کیں انتہائی مضرت رساں تھا۔ وہ کالج کے کل اختیارات بھی جن کا تعلق سکرٹیری اور ٹرسٹیوں سے تھا اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے حتیٰ کہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنے طرف دار ٹرسٹیوں کو طولانی خطوط لکھتے اور فارم بھی بھیجتے اور اپنے ذاتی اثر سے حصولِ مدعا میں برابر کام لے رہے تھے ٹرسٹیوں اور سکرٹیری کے تنازعات میں اپنے آپ کو ایک فریق بنا لیا تھا اور جب یہ تنازعات ختم ہو گئے اور مسٹر بیک کا بھی انتقال ہو گیا تو مسٹر مارسین نے اگرچہ تنازعات میں دخل نہیں دیا لیکن مطالبات کا تانتا باندھ دیا سرسید نے یوروپین اسٹاف کو جن امیدوں کے ساتھ مقرر کیا تھا وہ یہ تھیں کہ ہمارے یوروپین اسٹاف کو بہ نسبت روپے کے لالچ کے زیادہ تر علمی شوق ہو اور وہ اس نیت سے ہمارے کالج میں آئیں کہ مسلمانوں کی خراب حالت کو درست کریں اور اپنی قسمتوں کو کالج کی قسمتوں کے ساتھ بندھا ہوا سمجھیں اگر کالج کی حالت ترقی پاتی جائیگی تو ان کی حالت اور تنخواہ میں بھی ترقی ہوتی جائے گی۔

لیکن جب ہم کالج کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۸ء سے ہی مسٹر بیک نے اس قسم کے مطالبات کی بنیاد قایم کر دی تھی اور اپنے اضافہ کے متعلق سرسید سے ہمیشہ جھگڑتے رہتے تھے ۱۸۹۰ء میں جبکہ کالج کی مالی حالت بوجہ تغلّب درست نہ تھی انہوں نے دیگر یوروپین اسٹاف کو اپنا ہمخیال بنایا اور تنخواہوں کے اضافہ کے لئے حجتیں کیں اور اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ کالج کی نوکری چھوڑ دیں مگر سید محمود اور ان کے بعض رفقا نے سرسید کو اضافہ پر مجبور کر دیا مسٹر آرنلڈ جن کی نیکی اور ہمدردی کا نقش آج تک ہمارے قلوب پر ثبت ہے محض کمی تنخواہ اور اس خیال سے مستعفی ہو گئے کہ کالج نے ان کی خدمات کی قدر نہیں کی۔ مسٹر ماریسن کو بھی ہمیشہ اضافہ پر اصرار ہی رہا۔ سرسید کی زندگی میں کبھی یہ درخواستیں منظور ہوتی رہیں کبھی التوا میں رہیں مگر طلب و تقاضے میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔ تا آنکہ ۱۹۰۵ء میں انگلش اسٹاف نے مسٹر ماریسن کے ذریعہ ایک باضابطہ درخواست پیش کر دی اور اس میں اپنی غیر مطمئن حالت ظاہر کر کے چاہا کہ اس مسئلہ کا کہ:-

"انگلش اسٹاف کو اس کالج میں آیندہ کیا امیدیں ہو سکتی ہیں"

تصفیہ کر دیا جائے اور ساتھ ہی سالانہ اضافہ کی ایک اسکیم بھی پیش کر دی۔

مسٹر ماریسن کے بعد ۱۹۰۶ء میں مسٹر آرچبولڈ نے اس پر کچھ اور اضافہ کر کے مطالبہ کیا اور یہ شرط بھی اضافہ کر دی کہ:-

"اس اسکیم کا نفاذ پچھلے دنوں سے ہونا چاہئے کیونکہ اس کا فیصلہ اسی زمانہ میں ہونا چاہئے تھا"

جب اسٹاف کو کالج کی مالی حالت دکھائی گئی تو اس نے نہایت بے پروائی کے ساتھ لکھا کہ:-

"کالج اسٹاف کا یہ کام نہیں ہے کہ کالج کی مالی حالت کا اقتضا ہونے کی شرط اضافہ پر عائد کی جائے اس سے کچھ انہیں سروکار نہیں ہے اور نہ کالج کی مالی حالت پر ان کو خاص طور سے کچھ اختیار حاصل ہے اخراجات کی دوسری مدات میں کفایت شعاری کر کے پروفیسروں

پر خرچ کیا جائے نہ کہ عمارات پر صرف کیا جائے۔

مسٹر ماریسن نے اپنی چٹھی میں متنبہ کر دیا تھا کہ :۔

"اگر یہ اسکیم اس وقت منظور نہ کی گئی تو میرا گمان غالب یہ ہے کہ آئندہ موقع پر ٹرسٹی اس سے زیادہ وسیع شرائط منظور کرنے پر مجبور ہوں گے"

یہ طلب و تقاضہ صرف انگلش اسٹاف کے لئے ہی نہ تھا بلکہ ہندوستانی اسٹاف کے لئے بھی ایسے ہی جذباتِ ہمدردی نمایاں تھے۔ مسٹر ماریسن نے ایک خط میں لکھا تھا کہ :۔

"میں ایک ایسی اسکیم اسسٹنٹ (ہندوستانی) اسٹاف کے لئے بھی تیار کرنے والا ہوں کیونکہ وہ بھی اسی قدر توجہ کے مستحق ہیں لیکن بالفعل ان کے ساتھ بڑی بے توجہی کا برتاؤ ہوتا ہے"

چنانچہ اس کے بعد ہی وہ اسکیم بھی پیش ہوگئی پھر صرف کالج کا اسٹاف ہی اس عنایت سے محروم نہ رہا تھا بلکہ اسکول اسٹاف کی ترقیوں اور اضافوں کا سلسلہ بھی متحرک تھا۔

اسٹاف کا برتاؤ طلبا کے ساتھ اس میں شک نہیں کہ کالج نے سر سید کے زمانہ سے بہت زیادہ ترقی حاصل کر لی تھی۔ طلباء کی تعداد میں باوجود رکاوٹوں کے غیر معمولی اضافہ ہو رہا تھا اور اسٹاف حقیقتاً اس قسم کے تعلقات اب قائم ہی نہیں رکھ سکتا تھا جو کہ سر سید کے زمانہ میں طلبا کے ساتھ تھے۔ تاہم اُن اعلیٰ اخلاق کی امید جو ہر ملک و قوم کے شریف اساتذہ سے ہو سکتی ہے کالج کے اسٹاف سے قائم تھی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سب ہی سے یہ امیدیں کلیتہً غلط ثابت ہوئیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اکثر میں وہ ہمدردی باقی نہیں رہی تھی جس کی کہ یوروپین اسٹاف کے ممتاز فضلا و علما سے توقع تھی۔ مسٹر ماریسن کے خاص آورده مسٹر کارنا کی نسبت تو اخلاق کا لفظ ہی استعمال نہیں کیا جا سکتا یوں تو ان کی نسبت بہت سی باتیں مستند طور سے مشہور ہیں لیکن سب سے زیادہ وہ سنگین اور رنج دہ واقعہ ہے کہ جس کی مثال دنیا کے کسی اقامتی و غیر اقامتی تعلیم گاہ میں نہیں مل سکتی کہ جب انہوں نے انچارج پرنسپل

کی حیثیت سے بارہ وفات کی تعطیل جو ہمیشہ سے کالج میں ہوتی تھی بند کردی اور طلباء نے آنریری سکرٹیری کی ہدایت سے مجلسِ میلاد منعقد کرنے کے لئے ان سے درخواست کی تو وہ نہایت درشتی سے پیش آئے اور طلباء سے کہا کہ[1] :-

"تم بدبخت مفسد گروہ دور ہو تم سور کے بچوں کا گلہ"

خود مسٹر ماریسن میں جو مسلمانوں اور کالج کے لئے مایۂ امید تھے اخلاق اور عمدہ برتاؤ کے اعتبار سے تغیر پیدا ہوگیا تھا وہ کالج سے واپس جانے والے تھے اور ان کی یہ تحریک تھی کہ مسٹر کارنا (مسبوق الذکر) پرنسپل مقرر کئے جائیں اور اس کو منظور کرانے کے لئے وہ ہر امکانی کوشش کر رہے تھے۔ ٹرسٹیوں کی اکثریت اس تحریک کے خلاف تھی اس کے علاوہ چند نوجوان طلباء علی گڑھ کی مشنری لیڈی کے یہاں انجیل کا سبق پڑھنے جاتے تھے جس کو اکثر دوراندیش ٹرسٹیوں نے خطرناک سمجھکر طلبا کو جانے سے روک دیا تھا اس کا اثر بقول[2] نواب وقار الملک یہ ہوا کہ :-

"اس روز سے مسٹر ماریسن وہ پہلے سے مسٹر ماریسن نہیں رہے ہیں اور اب ان کی اخلاقی حالت طلباء کے ساتھ یہ ہے کہ اپنی کوٹھی پر طلبا کو آنے کی انہوں نے قطعی ممانعت کردی ہی ان کو اس گزشتہ مزاحمت سے سخت برہمی پیدا ہوگئی ہے اور علی گڑھ میں جو ٹرسٹی ہروقت بود وباش اور وہاں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی متفقہ اور قطعی رائے یہ ہی کہ مسٹر کارنا اور دوسرے اسٹاف کی طبائع کی موجودہ حالت مسٹر ماریسن کی اس متبدلہ کیفیت کے اثر سے ہے اور اب جو دن کہ مسٹر ماریسن کے تشریف لے جانے کے باقی ہیں خدا کرے کہ وہ خیر وعافیت سے بسر ہو جاویں اور شکریوں کے نعروں ہی میں رخصت ہوں ورنہ بہت اندیشہ ہی کہ آئندہ اس پانچ چھ مہینہ کی مدت میں وہ واقعات پیش نہ آجائیں جن سے علانیہ

---

[1] سرکلر منجانب نواب وقار الملک موسومہ ٹرسٹیان مدرستہ العلوم مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۰۴ء

[2] خط نواب وقار الملک موسومہ مولانا حالی مرحوم۔ مکاتیب حصہ دوم۔

کشش پیدا ہو جائے اور بے لطفی ترقی کر جائے"۔

مسٹر ماریسن کے بعد انگلستان میں پرنسپلی پر مسٹر آرچبولڈ کا انتخاب کیا گیا جن کے علم وفضل اور علمی مذاق سے یقین تھا کہ کالج میں علمی فضا پیدا ہو جائے گی اور اساتذہ وطلبا کے تعلقات خوش گوار ہو جائیں گے لیکن علی گڑھ کے چند روزہ قیام کے بعد وہ یقین غلط ثابت ہوا اور تعلقات زیادہ کشیدہ ہوتے گئے جس کا نتیجہ اس اسٹرائک کی صورت میں نکلا جو نواب محسن الملک کی زندگی کے آخری سال میں ہوئی تھی اور جو ان کے مرض الموت سے تعبیر کی جاتی ہے۔

ہندوستانی اسٹاف نے بھی اپنے سینیر اسٹاف کی تقلید شروع کر دی غرض طلبا اور اسٹاف کے مابین ہمدردی ومحبت اور اعتماد میں مسلسل اور تیزی کے ساتھ کمی آ رہی تھی۔

کوششوں کا ردِّ عمل

نواب صاحب نے سرسید میموریل کو سرمایۂ مسلم یونیورسٹی کی شان میں قائم کرنے سے تمام ملک کی توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا اور ان کی تمام تر کوشش وہمت اس امر پر صرف ہو رہی کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ رنگون سے کراچی اور پشاور سے لیکر مدراس تک کے طلبا کالج کے احاطہ میں نظر آئیں بلکہ بحرین وفارس تک کے طالب علم اپنے ہندوستانی مسلمان بھائیوں کے ساتھ دکھائی دیں اور اس مقصد میں کامیابی کے لئے انہوں نے باوجود خرابی صحت اور پیرانہ سالی کے سخت سخت موسموں میں جو سفر کئے ہیں وہ خود ان کی اس ہمت اور کوشش کے گواہ ہیں ایک ضعیف العمر شخص کے لئے جس کی صحت پر ہمیشہ مختلف امراض کا حملہ ہوتا ہو آسان نہیں ہے کہ علی گڑھ سے رنگون تک کا سفر اختیار کرے لیکن وہ صرف اس مقصد کے لئے سفر کرتے ہیں اور ہر طرف سے اُن کی کوششیں مشکور ہوتی ہیں ہر گوشۂ ہند سے مسلمان طلبا کی درخواستیں داخلہ کے لئے آتی ہیں لیکن وہ سکریٹری کے بغیر علم واطلاع نامنظور کر دی جاتی ہیں خود مسٹر ماریسن نے اپنے اس طرز عمل کو (سر) مولوی عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا، لاہور سے انگلستان میں ظاہر کیا تھا اور پھر انہوں نے کالج کی مشہور اسٹرائک کے

بعد ۴ اپریل ۱۹۰۰ء کو نواب محسن الملک کے نام ایک نہایت طولانی خط لکھا تھا اس میں ڈسپلن کا پورے طور پر نہ ہونے، کثرت طلبا اور اس کی وجہ سے ممبران اسٹاف کا طلبا سے گہری واقفیت کا ناممکن ہو جانے، اور اسٹاف کے اثر کی ناگزیر کمی کو اسٹرائک کے اسباب بیان کرنے کے بعد ظاہر کیا تھا کہ:-

"طلباء کی تعداد میں ترقی کئی برسوں سے انگلش اسٹاف کے سخت تردد کا باعث سمجھی جاتی ہے اور ایک عرصہ سے یہ بات ظاہر تھی کہ ہم ایسی حد پر پہنچنے والے ہیں جیسی کہ ابھی پیش آئی"۔

آخر میں انہوں نے لکھا تھا کہ:-

"میں ٹرسٹیوں سے سرگرمی کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ جو سچا علاج ہو وہ کریں یعنی کالج میں جو طلبا داخل ہوں ان کی تعداد کو محدود کیا جائے"۔

ظاہر ہے کہ اسٹاف کے اس تردد نے طلبا کی تعداد اور مسلمانوں کی اس عام دلچسپی پر جو اپنے نونہالوں کو قومی کالج میں تعلیم دلانے کی نسبت رہتی ہے کیا اثر ڈالا ہوگا ان حالات سے ٹرسٹی بھی بے خبر نہ تھے اور بعض روشن خیال ٹرسٹی اس کو ایک مصیبت تصور کرتے تھے چنانچہ ۱۹۰۹ء میں شیخ عبداللہ صاحب نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ:-

"مجھے معلوم ہے گزشتہ چند سال سے ہمارے اسٹاف کے بعض ممبروں کے دماغ میں یہ خیال سمایا ہوا ہے کہ:-

"تاوقتیکہ ہم طلبا کی تعداد محدود نہ کریں وہ ڈسپلن اور اعلیٰ معیار خوبی کو کالج میں برقرار نہیں رکھ سکیں گے"۔

"یہ خیال مسٹر بیک کے خیالات سے کس قدر متضاد ہے جو کہا کرتے تھے کہ ٹرسٹیوں کو کم سے کم ایک ہزار بورڈروں کے لئے انتظام کرنا چاہیئے اس معاملہ میں موجودہ ممبران اسٹاف اور مسلمانوں اور ٹرسٹیوں کے خیالات میں بعد المشرقین کی نسبت خیال کی جاتی ہے اگرچہ پرنسپل اور اسٹاف کے لئے یہ باعث آسانی ہوگا کہ کالج میں صرف ایک محدود تعداد طلبا نگرانی کے

لئے رہ جائے لیکن صرف اس کی خاطر مسلمان طالبانِ علم کو اس کالج میں آنے سے محروم رکھنا ایک مصیبت سے کم نہ ہوگا۔"

ہز آنر سر انٹونی میکڈانلڈ کی مداخلت

۱۸۸۹ء میں کالج کے متعلق جو قانون وضع ہوا تھا اس میں صوبہ کے حاکمِ اعلیٰ (لفٹننٹ گورنر) کو کالج کا پیٹرن قرار دیا گیا تھا اور اس طرح پیٹرن کو اپنی سرکاری حیثیت سے کالج کے انتظامی معاملات میں مداخلت کے بہت سے مواقع حاصل تھے مگر سرسید کی زندگی میں کسی پیٹرن نے خفیف سی مداخلت بھی نہیں کی اور نہ سکرٹیری کی آزادی پر کوئی روک قائم ہوئی۔

سرسید کے انتقال کے وقت ہز آنر سر جیمس لاٹوش قائم مقام لفٹننٹ گورنر تھے انھوں نے کمال ہمدردی کے ساتھ اپنی توجہ درستی و اصلاحِ حالات پر مبذول کی اور اس میں شک نہیں کہ اس خطرناک زمانہ میں سر جیمس کی ذات باعثِ نجات بن گئی تھی لیکن قائم مقامی کا زمانہ بہت جلد ختم ہوگیا اور سر انٹونی میکڈانلڈ نے پھر صوبہ کا چارج لیا۔ سر انٹونی بلاشبہ کالج کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے اور انھوں نے کالج کے قیامِ نظام استقلال اور بہبودی پر ہمدردانہ توجہ کی مگر اس ہمدردی میں مداخلت بھی شامل تھی اور ساتھ ہی وہ اس کالج کی عنانِ اختیار یورپین اسٹاف کے ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ دیدینا چاہتے تھے چنانچہ ۱۸۹۸ء میں جو تقریر ہز آنر نے کی تھی اس میں جا بجا یورپین اسٹاف کی مراعات اور مسٹر بیک کی توسیع اختیارات کی طرف اشارہ تھا اور کالج کی آئندہ زندگی یورپین اسٹاف کے توسیع اختیارات پر منحصر رکھی تھی۔

اردو ہندی کے مسئلہ میں اختلاف کا اثر

اسی دوران میں سر انٹونی میکڈانلڈ نے اردو ہندی کے متعلق جو مشہور رزولیوشن صادر کیا اس نے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا کر دیا۔ نواب محسن الملک نے قومی نقطۂ نظر سے اس کے خلاف احتجاج کرنے میں نمایاں حصہ لیا اگرچہ اس میں انتہائی اعتدال شامل حال تھا مگر ہز آنر کو سخت ناگواری پیدا ہوئی جس کو مختلف طریقوں سے انھوں نے ظاہر بھی کر دیا۔

ہز آنر اور سید محمود کی خط و کتابت | اسی زمانہ میں سید محمود کے پیٹرن بنائے جانے کی تحریک پیش تھی لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ جب کچھ مزاج درست ہوتا تو ان کے بعض رفیق سکرٹیری شپ سے علیحدہ ہو جانے کا رنج تازہ کرا دیتے اور ایسے امور کے محرک ہوتے جن سے کچھ نہ کچھ پیچیدگیاں پڑجاتیں۔ سید محمود نے اپنے پیٹرن ہونے سے انکار کے وجوہ ایک خط کے ذریعہ سے ہز آنر کے سامنے پیش کئے۔ جس کے فقرہ نمبر۳ میں انہوں نے لکھا کہ:۔

"کالج کے اصلی بہی خواہوں کو یہ امر ضرور رنج و افسوس کا باعث ہوگا کہ میرے والد سرسید مرحوم کی وفات کے بعد بہت جلد کالج کے معاملات کی نوبت جس کو پولیٹیکل یا نیم پولیٹیکل ایجی ٹیشنوں سے محفوظ رکھنے کے واسطے انہوں نے اپنی تمام عمر کوشش کی تھی کیونکہ وہ ایک خالص خیراتی اور تعلیمی انسٹی ٹیوشن تھا ادنی پارٹی پالٹکس پر پہنچ گئی۔"

اس فقرہ نمبر۳ کے جواب میں ہز آنر نے یہ اطلاع دی کہ:۔

"جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر خیال فرماتے ہیں کہ کالج کے انتظام میں ایسے معاملات کے داخل ہونے کو جن سے پارٹی پالٹکس کی بو پائی جائے آپ کا نامناسب سمجھنا حق بجانب ہے اور اس بارہ میں جناب ممدوح ٹرسٹیوں کو آپ کی رائے سے مطلع کرنا چاہتے ہیں ہز آنر کو اس امر میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ بحیثیت ایک جماعت کے ٹرسٹیوں کی یہ رائے ہوگی کہ کالج ایک تعلیمی انسٹی ٹیوشن ہے نہ کہ ایک پولیٹیکل مجمع اور اس کے منیجروں اور اسٹاف کو کالج کے منیجر اور اسٹاف ہونے کی حیثیت سے پولیٹیکل ایجی ٹیشنوں سے علیحدہ رہنا واجب ہے۔ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کو بلاشبہ مسلمانوں کی ترقی اور مسلمانوں کی فلاح اور بہبودی کے ساتھ ہمدردی کرنی ضرور ہے لیکن کالج بغیر اس کے کہ جو نیک نامی اس کو سرسید احمد کی حین حیات میں ایک ایسے تعلیمی انسٹی ٹیوشن ہونے کی حاصل ہوئی تھی جس کو پارٹی پالٹکس سے کچھ تعلق نہ تھا ایسا کر سکتا ہے۔"

تاہم نواب صاحب نے ہز آنر سے ملاقات کرکے بالمشافہ غلط فہمیوں کے دور کرنے کی بھی کوشش کی لیکن ہز آنر نے صاف جواب دیدیا کہ "جبکہ بذریعہ تحریر اردو ناگری کے مسئلہ پر

مراسلت ہوسکتی ہی تو آپ کے نینی تال تشریف لانے کی تکلیف گوارا کرنا بے ضرورت ہوگا۔

چٹھی کی اشاعت | ہز آنر نے ٹرسٹیاں کالج کو مرعوب کرنے کے لئے سید محمود کی چٹھی کو طبع کرا کے تمام ٹرسٹیوں اور متعلقین کالج کے پاس بھیجا۔

نواب صاحب کا استعفا | نواب صاحب نے نزاکتِ حالات کو اچھی طرح محسوس کرلیا ان کے لئے صوبہ کے حکمرانِ اعلیٰ کا مقابلہ ناممکن تھا اس لئے ناسازی طبیعت کا عذر کرکے استعفا پیش کردیا۔

ہز آنر کی ناراضی کا صاف اظہار اور ایک چٹھی | جب یہ استعفا سر انٹونی کے سامنے پیش ہوا اور اسی سلسلہ میں ہز آنر اور مسٹر ماریسن میں بالمشافہ گفتگو ہوئی تو اس کے بعد مسٹر ماریسن کے نام حسب ذیل چٹھی موصول ہوئی:

"کیمپ لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال و مغرب و اودھ"

۱۰ اکتوبر ۱۸۹۹ء

ڈیر مسٹر ماریسن!

لفٹنٹ گورنر خیال فرماتے ہیں کہ آپ کے پاس ہز آنر کی ملاقات کے نتیجہ کا ایک معتبر ریکارڈ (تحریر) رہنا چاہئے تاکہ آپ اس کو ٹرسٹیوں کی کمیٹی میں پیش کرسکیں اس ملاقات کے نتیجے مختصر طور پر یہ ہیں۔

(۱) ٹرسٹیوں کو اس امر کا خود فیصلہ کرنا چاہئے کہ آنریری سکرٹیری کے استعفے کو منظور کریں یا ان سے اس کے واپس لینے کی درخواست کریں۔ یہ امور اس بات کے مقتضی نہیں ہیں کہ اس میں لفٹنٹ گورنر کی مداخلت کرنے یا اصلاح دینے کی ضرورت ہو۔

(۲) اس بارہ میں جو کچھ ٹرسٹی باہم فیصلہ کریں وہ بوجہ اس کے کہ ان کو اپنے افعال کی آزادی حاصل ہے اس کی پیروی کریں اس موقع پر لفٹنٹ گورنر ان کے خیالات یا فیصلہ میں حصہ لینا نہیں چاہتے بلکہ وہ دونوں سے علحدہ ہیں۔

ہز آنر ایک اور بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں انہوں نے آپ سے بیان کیا تھا کہ وہ پبلک معاملات پر ہر قسم کے اظہار رائے کو جو ایمانداری اور نیک نیتی سے کیا جائے مبارک اور عمدہ

سمجھتے ہیں۔ ہز آنر کی رائے میں علانیہ طور سے بحث و مباحثہ کرنا اور رفاہ عام کی تجویزوں پر نکتہ چینی کرنی اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ خفیہ طور پر اس کی مذمت کی جائے۔ تاہم حضور ممدوح کا خیال ہے کہ بموجودگی ان تعلقات کے جو گورنمنٹ اور مدرستہ العلوم علی گڑھ کے درمیان قایم ہیں یہ امر ٹرسٹیوں کے معتمد ریپرزنٹیٹو کے مناسب نہیں ہے کہ بغیر اس کے کہ ٹرسٹیوں کی رائے سے گورنمنٹ کو مطلع کیا جائے وہ ایک باضابطہ ایجی ٹیشن کے بانی مبانی ہوں جو گورنمنٹ کی ایک تجویز کے خلاف کی گئی ہو سر سید احمد اس طریقہ پر کبھی کارروائی نہ کرتے قبل اس کے کہ وہ ایک پبلک ایجی ٹیشن کی سربراہی کریں وہ ضرور گورنمنٹ کے ساتھ براہ راست خط و کتابت کرتے اور جو کچھ اعتراض ان کو گورنمنٹ کے طرز عمل پر ہوتا اس کو وہ ظاہر کرتے اور گورنمنٹ کی عمدہ منشا اور نیک نیتی پر کامل اعتماد اور بھروسہ کر کے وہ گورنمنٹ سے درخواست کرتے کہ ان کے دلائل پر پوری طرح غور کیا جائے اور ان کی یہ درخواست کبھی نامنظور نہیں ہوتی سر انٹونی میکڈانلڈ کی رائے میں یہ امر نہایت غیر مستحسن ہے کہ وہ لوگ جو سر سید احمد کے کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں یا جو ان کے قایم مقام ہونے کی کوشش کرتے ہیں گورنمنٹ پر اعتماد و بھروسہ کرنے کی پالیسی کو چھوڑ دیں۔

ہز آنر کو پورا یقین ہے کہ اکثر ٹرسٹی اس تبدیلی کو پسند نہ کریں گے جس کی وجہ سے بعض ٹرسٹی بلاشبہ مخدوش حالت میں ہو گئے ہیں۔

لفٹنٹ گورنر درخواست کرتے ہیں کہ آپ براہ مہربانی یہ چٹھی ٹرسٹیوں کی کمیٹی کے روبرو پیش کر دیں اور جو فیصلہ وہ آنریری سکرٹری کے استعفے کے متعلق کریں اس سے پریسیڈنٹ کے ذریعہ سے بہ تسلسل ان کی سابق چٹھی مشعر اطلاع استعفے ہز آنر کو مطلع کیا جائے۔

(دستخط) ڈبلیو بی ڈگلس کپتان پرائیویٹ سکرٹری

پرنسپل پولٹیکل ایجنٹ کی حیثیت میں

اس طرح گویا ہز آنر نے نہ صرف آنریری سکرٹری کے ایجی ٹیشن پر ناراضی ظاہر کی بلکہ پرنسپل کی اصلی پوزیشن کو ریاستوں کے پولٹیکل ایجنٹوں کی پوزیشن میں

تبدیل کر دیا۔

ڈائرکٹر کی ناراضی

اسی طرح مختلف طریقہ سے دباؤ اور ناراضی ظاہر کی گئی اگست ۱۹۰۰ء میں ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے کسی قدر ترشی کے ساتھ جواب طلب کیا کہ پرنسپل کی رپورٹ میں گورنمنٹ کی اس امداد کا جو ۱۸۹۹ء میں دی گئی ہے کیوں ذکر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس رپورٹ میں خاص طور پر اس کا تذکرہ تھا اور ہز آنر کے شکریہ کا رزولیوشن بھی پاس کیا گیا تھا اور بذریعہ تار اس کی نقل بھی بھیجی گئی تھی۔

ہز آنر کی ذاتی کاوش کا ظہور

ہز آنر سر انٹونی میکڈانلڈ کے خیالات میں نواب صاحب کی طرف سے کچھ ایسا تغیر ہو گیا تھا کہ ان کو نواب محسن الملک کا خطاب بھی ناگوار تھا جس کو ۱۸۸۷ء میں ہز اکسیلنسی گورنر جنرل نے خوشی سے تسلیم کیا[۵۱] تھا اور سرکاری مراسلت اور حکّام انگریزی کی خط وکتابت میں اس کے استعمال ہونے کی اجازت دیدی تھی مگر اب ۱۹۰۰ء میں پروانشیل[۵۲] گورنمنٹ کی اطلاع کی روسے برٹش انڈیا میں ملازمت حیدر آباد ترک کرنے کی وجہ سے قابل تسلیم نہیں رہا حالانکہ اس ترک تعلق کے بعد بھی برٹش انڈیا میں اور پھر انتقال کے وقت تک یہ خطاب برابر استعمال ہوتا رہا[۵۳]۔

تائید غیبی

مگر خدا کی مہربانی شامل حال تھی سر انٹونی رخصت ہو گئے اور ہز آنر سر جیمس لاٹوش[۵۴] نے مستقل طور سے حکومتِ صوبہ کا چارج لیا ان کو سرسید کے مشن اور مسلمانوں کی تعلیم سے حقیقی دلچسپی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس تعلیم گاہ کے حق میں ابر رحمت تھے جن کی مہربانیوں کی شکرگزاری

---

۵۱ خط رزیڈنٹ مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۸۸۷ء ۵۲ خط سکرٹری گورنمنٹ مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۰ء

۵۳ ٹیلیگرام پرائیوٹ سکرٹری ویسرائے ۳۱ دسمبر ۱۸۹۸ء

۵۴ اگرچہ کالج متعدد اعلیٰ حکمراں صوبہ کی عنایتوں کا مشکور ہے لیکن یہ ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ ہز آنر سر جیمس سے زیادہ کسی نے ہمدردی اور مہربانی نہیں کی خطرات کی تاریکیوں میں ان کی ذات شمع امید تھی وہ اپنے زمانہ حکومت میں رسمی طور پر نہیں بلکہ بہ تقاضائے ہمدردی پانچ مرتبہ کالج میں تشریف لائے۔

سے کبھی مسلمان سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

ہز آنر سر جیمس لاٹوش کی مسیحائی

جب پیٹرن کی حیثیت سے ان کے سامنے سکرٹیری کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا تو ۶ ار نومبر ۱۹۰۱ء کو پریسیڈنٹ ٹرسٹیان کو حضور ممدوح نے ایک چٹھی بھیجی جس میں تحریر فرمایا کہ:۔

"مجھ کو یقین ہے کہ ایسا عہدہ دار منتخب کیا جائے گا کہ جس کے تحت میں کالج ترقی اور بہبودی کے راستہ میں اور بھی زیادہ آگے قدم بڑھائے گا۔ ممالک ہٰذا کی گورنمنٹ کا بحیثیت پیٹرن کالج کے یہ کام نہیں ہے کہ عہدۂ آنریری سکرٹیری کے لئے ناموں کا اشارہ دے یا کسی قسم کی صلاح دے جس سے سمجھا جائے کہ وہ ٹرسٹیوں کی آزادانہ پسند میں دست اندازی کرتی ہے کیونکہ یہ بات سب سے زیادہ ضروری ہے کہ ان معاملات میں کالج کی خود مختاری بدستور اسی طرح قائم رکھی جائے جیسی کہ سر سید مرحوم کے زمانہ میں تھی۔ یہ کالج گورنمنٹ کالج نہیں ہے گو میں اور میرے جانشینان اس کی ترقی میں دل سے متوجہ رہی ہیں۔"

واپسی استعفےٰ پر قوم کا اصرار

نواب صاحب کے اس طرح مستعفی ہو جانے سے قوم میں اضطراب و ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور تمام قومی اخبارات میں واپسی استعفےٰ پر اصرار کیا جا رہا تھا نیز پرائیویٹ طور پر ہمدردانِ قوم اسی کوشش میں مصروف تھے کہ نواب صاحب اپنا استعفا واپس لے لیں۔

نواب وقار الملک کی کوشش

نواب وقار الملک نے ہز آنر کو ایک خاص چٹھی بھی لکھی تھی اور جب ۳۱ جنوری ۱۹۰۲ء کو ٹرسٹیوں کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو نواب وقار الملک نے کہا کہ:۔

"میں جناب صدر انجمن صاحب سے اجازت چاہتا ہوں کہ مدِ سوم مندرجۂ اجنڈا کے تصفیہ سے پہلے جس میں نواب محسن الملک بہادر کے بعد میرے آنریری سکرٹیری مقرر ہونے کی تحریک کی گئی ہے۔ مدِ پنجم کا فیصلہ کیا جائے جس میں میں نے تحریک کی ہے کہ نواب محسن الملک بہادر ہی دوبارہ اس عہدہ کے لئے منتخب کئے جائیں۔ یہ امر کہ نواب محسن الملک اپنے مکرر انتخاب کو منظور کریں گے یا نہیں نواب محسن الملک بہادر پر منحصر ہے وہ جانیں اور ان کا دین و ایمان ہم کو اول خود اپنا فرض جو اس مسئلہ کے متعلق ہے ادا کرنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت

ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک نواب محسن الملک ہی کے بہ لحاظ ان کی نہایت بیش بہا خدمات کے اس عہدہ پر رہنے کے واسطے آرزومند ہے اور ہم لوگ جو اس قومی کالج کے ٹرسٹی ہیں ہماری حالت بمنزلہ قوم کے وکلا کے ہے اور ہمارا یہ فرض ہے کہ اس وقت ہم اس ہردل عزیزی کے لحاظ سے جو نواب صاحب ممدوح کو قوم میں حاصل ہے انہیں کو دوبارہ منتخب کرنے کے لئے ووٹ دیں اس کے علاوہ اس وقت ہمارا یہ طرز عمل جو درحقیقت ایک اعتراف نواب صاحب ممدوح کی نہایت قیمتی خدمات کا ہے آئندہ ان لوگوں کی ہمت افزائی کا بھی ایک موجب ہوگا جو قومی خدمات پر اپنے آرام و آسائش کو قربان کریں اور خود ایک قوم کے لئے یہ افتخار و عزت کی بات ہے کہ وہ اپنے محسن کے احسانات کی قدرشناسی عملی طور سے کرے غرضکہ ہر ایک حیثیت سے میرے نزدیک نواب محسن الملک کو دوبارہ اس عہدہ کے لئے منتخب کرنا ہمارے قومی فرائض میں سے ہے۔"

نتیجہ | نتیجہ میں نواب صاحب کا استعفےٰ نامنظور رہا لیکن ان کو منظوری استعفےٰ پر برابر اصرار رہا۔ اس روئداد کی ہز آنر کو بھی باضابطہ اطلاع دی گئی۔

سر جیمس کی تشریف آوری اور فیصلہ | اس اطلاع پر ہز آنر کے حکم سے پرائیوٹ سکرٹیری نے پریسیڈنٹ ٹرسٹیان کو مطلع کیا کہ :-

"ہز آنر ۱۳ مارچ کو کالج کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں اور میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آیا یہ امر پسندیدہ ہے کہ جناب ممدوح اس وقت ٹرسٹیوں اور نواب محسن الملک اور وقار الملک مولوی مشتاق حسین سے گفتگو فرماویں۔ ہز آنر کے نزدیک یہ امر پسندیدہ ہے کہ اس معاملہ کا تصفیہ علی گڑھ میں کیا جائے اور اس عرصہ میں نواب محسن الملک کو غالباً عہدۂ سکرٹیری کا کام انجام دینے سے کچھ عذر نہ ہوگا۔"

پریسیڈنٹ ٹرسٹیان نے شکرگزاری کے ساتھ ہز آنر کو مدعو کرکے ٹرسٹیوں کو مطلع کردیا اور تاریخ معینہ پر ہز آنر کالج میں تشریف لائے حضور ممدوح کے منشاء کے مطابق ۲۴ ٹرسٹی ایک کمرہ

میں جمع ہوئے اور باہم جو گفتگو ہوئی وہ صیغۂ راز میں رہی صرف اس قدر ظاہر ہوا کہ :-

"حضور ممدوح نے پریسیڈنٹ سے دریافت کیا کہ ٹرسٹیوں نے کیا فیصلہ کیا ہے"

پریسیڈنٹ نے کہا کہ :-

"ٹرسٹیوں نے اپنے سالانہ جلسہ میں نواب محسن الملک بہادر کو سکرٹیری منتخب کیا ہے اور اسی فیصلہ پر سب قائم ہیں"

اس پر ہز آنر نے نواب محسن الملک بہادر سے پوچھا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔
انہوں نے ایک مفصل اور طوفانی تقریر میں جو ۴۰ منٹ میں ختم ہوئی اپنے انکار کے وجوہ بیان کئے اور اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ :-

"علاوہ کالج کے اور بھی قومی کام ہیں اور اکثر قومی حقوق کی حفاظت میں حصہ لینے اور پولیٹیکل مسائل میں جو مسلمانوں سے متعلق ہیں شریک ہونے کی ضرورت ہوتی ہے اگر کالج کا سکرٹیری صرف سکرٹیری ہونے کی وجہ سے اس میں بطور خود بھی حصہ نہیں لے سکتا اور شریک نہیں ہو سکتا تو وہ سکرٹیری ہونا منظور نہیں کر سکتے لیکن اگر اس کو آزادی ہے اور اپنی رائے اور منشار کے موافق وہ اس میں حصہ لے سکتا ہے اور ایسی مجالس میں شریک ہو سکتا ہے تو وہ سکرٹیری کے عہدہ کو خوشی سے قبول کرنے پر آمادہ ہیں"

ایک اصولی مسئلہ کا حل

ہز آنر نے فرمایا کہ :-

"گورنمنٹ کو ان پر اعتماد ہے اور وہ کسی کی آزادی کو روکتی نہیں"

اس پر نواب محسن الملک بہادر نے اپنی آمادگی سکرٹیری کے عہدہ کو دوبارہ قبول کرنے پر ظاہر کی اور اس کو سنکر ہز آنر نے اپنی خوشی کا اظہار کیا نواب وقار الملک مولوی محمد مشتاق حسین نے ہز آنر کے اس فیصلہ پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ :-

"حضور نے اس فیصلہ سے ہم ٹرسٹیوں ہی کو مشکور نہیں کیا بلکہ قوم کو بھی آپ نے ممنون فرمایا ساری قوم آپ کی شکر گزار ہوگی"

ایڈریس اور جواب اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور ہز آنر اسٹریچی ہال میں تشریف لائے۔ ٹرسٹیوں کی طرف سے خیر مقدم کا ایڈریس پیش ہوا جس میں کالج کی مالی ترقی اور طلباء کے اضافہ، مستقبل کے کام، اسکالرشپ فنڈ اور معطیان گرامی قدر کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

اس کے جواب میں ہز آنر نے کالج کی اس ترقی پر اظہار مسرت اور منتظمین کی ذمہ داری کی زیادتیوں کی طرف اشارہ کرنے اور مبارک باد دینے کے بعد فرمایا:۔

"میں یہاں آج خاص طور پر ٹرسٹیز کے ساتھ مشورہ کے لئے آیا ہوں کیونکہ قواعد کے تحت میں بحیثیت لفٹنٹ گورنر کے اس کالج کا پیٹرن ہوں اور اگرچہ میں نہیں خیال کرتا کہ کالج کے ذمہ داران اساسی کی خودداری اور آزادی میں کسی قسم کی مداخلت جائز ہوگی تاہم دشواریوں کے وقت میرا فرض ہے کہ میں نصیحت اور ہدایت کروں اور بجائے اس کے کہ ایسی نصیحت لکھکر کسی ذریعہ سے بھیجی جائے میں یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ خود کالج آکر میں زبانی آپ لوگوں کو ضروری ہدایت کردوں۔

یہ امر یقیناً قابل مسرت ہوگا کہ نواب محسن الملک نے میرے سامنے انتخاب ثانی پر جو ۱۳ر جنوری کی ٹرسٹیز میٹنگ میں کثرت رائے سے طے پایا تھا آئندہ تین سال کے لئے کالج کے سکرٹیری شپ کے فرائض انجام دینے کو منظور کرلیا ہے۔ میں اس فیصلہ پر اظہار مسرت کرتا ہوں اور میرا جہاں تک خیال ہے کالج کے فوائد کے لئے یہ بہتر سے بہتر خدمت ہوگی۔ مجھے کالج کے خیرخواہ اور خالص بہی خواہ اصحاب کے بے شمار خطاب تک موصول ہوتے رہے ہیں جن میں صرف یہی امید و خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ نواب محسن الملک سکرٹیری شپ کے عہدہ کو دوسری مدت کے لئے قبول کریں۔"

اطمینانِ عام ہز آنر کی اس پبلک تقریر سے جو انتشار عام تھا وہ طمانیت میں مبدّل ہوگیا نواب صاحب نے اپنا استعفےٰ واپس لے لیا اور یک گونہ اطمینان کے ساتھ اپنا کام شروع کردیا۔

عربی تعلیم کے اجراء کی تحریک نواب صاحب ہنوز کالج کی ان مشکلات سے جن کو ہم نے اجمالاً بیان کیا

ہے عہدہ برآنہ ہوئے تھے کہ ان کی کوشش اور ان کے نتائج پر ایک ایسی طرف سے کہ جدہر وہم بھی نہ تھا بمب کا غضب ناک گولہ پھٹا۔ نواب صاحب اور ہمدردانِ کالج کی تمام کوششوں کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان انگریزی کی اعلےٰ تعلیم کی طرف متوجہ ہوں اور کالج کو تمام ضروریات وسامان کے ساتھ ایسا کردیں کہ وہ آسانی سے یونیورسٹی بن سکے۔

مسٹر براؤن اور مسٹر مارین کی تحریکیں

اسی اثناء میں (۱۹۰۳ء) مسٹر گارڈنر براؤن پروفیسر نے عربی تعلیم کی ایک اسکیم پیش کردی مسٹر مارین پرنسپل نے اپنی پہلی رائے کے برخلاف جو انہوں نے محمدن یونیورسٹی کی تائید میں ظاہر کی تھی اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ :۔

"اگرچہ عربی تعلیم دل ودماغ کے لئے ایک عمدہ ترکیب ہو مگر اس بات سے بالکل قاصر ہے کہ طالب علموں کو اپنے حصول معاش کے وسائل بہم پہونچائے۔"

اب پُر زور طریقہ سے اس اسکیم کی تائید کی اسی اثناء گورنمنٹ آف انڈیا نے لوکل گورنمنٹوں کو تعلیم کے لئے کچھ روپیہ دیا تھا۔

گورنمنٹ صوبہ متحدہ کی تجویز

صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے اس کو بنارس ہندو کالج میں سنسکرت اور محمدن کالج میں عربی تعلیم کے لئے اور میور سنٹرل کالج الہ آباد میں سائنس کی تعلیم کے لئے دیا جانا تجویز کردیا

اسکیم کا خلاصہ

تعلیمِ عربی کی اس اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ جو طلبا بطور زبان ثانوی عربی لیتے ہیں ان کی تعلیم کا بہتر بندوبست کیا جائے اور ہندوستانی اور مصری پروفیسر مقرر ہوں عربی علوم کی تکمیل وتحقیقات کے لئے ایک دارالعلوم قائم کیا جائے جس میں بہ کثرت وظائف دئے جائیں۔ فیلوشپ ہوں اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ عربی کی نایاب اور غیر مطبوعہ کتابوں میں جو علوم وفنون مخفی ہیں ان کو پریس کے ذریعہ منظرِ عام پر لایا جائے تاکہ شائقینِ علوم ان سے مستفید ہوں اور مسلمان علم کو علم کے لئے حاصل کریں اور روحانی تعلیم کو دنیاوی تعلیم پر مقدم کردیں۔ ورنہ کم از کم کالج میں ایک مکمل اور لائق اسٹاف ہو اور وہ اُن طلباء کو جو عربی میں ایم اے کی ڈگری لینا چاہیں اور بی اے کی طلبا کو جو عربی لیں موجودہ سائنٹفک طریقوں سے تعلیم دے۔

اس تحریک کا اثر اس اسکیم اور گورنمنٹ کی حمایت نے مسلمان ماہرین تعلیم میں ایک ہیجان پیدا کر دیا کیونکہ یہ خیال ہو گیا کہ اس وقت جو کوششیں کالج کے استحکام کے لئے ہو رہی ہیں اُن میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی نیز مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ پڑ جائے گا۔

نواب صاحب کے اختلاف کی اشاعت نواب صاحب نے مردانہ وار نہایت آزادی کے ساتھ اس اسکیم کی مخالفت میں آواز بلند کی ان کے نزدیک عربی کے انتظام کے لئے نہ تو یہ وقت مناسب تھا اور نہ مصلحت وقت کے موافق تھی انھوں نے متعدد مدلّل مضامین شائع کئے اور اس میں اسکیم کے مضر پہلوؤں کو نہایت واضح طور پر نمایاں کیا ان کا خیال تھا کہ :۔

"اس وقت مسلمانوں کو جو توجہ انگریزی تعلیم اور اُس کے سامان کی تکمیل کی طرف ہو چلی ہے وہ پھر جائے گی یا منقسم ہو جائے گی اور ایسی حالت میں جبکہ اس وقت تک کالج کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں ہے کہ اس کی آمدنی سے ایک صیغہ کا خرچ بھی چل سکے، قانونی تعلیم کے لئے کوئی پروفیسر نہیں ہے عمارتیں غیر مکمل ہیں اور ضروری عمارتوں کے نقشے تک مرتب نہیں ہو سکے ہیں طلبا کو دماغی تعلیم میں ترقی کرنے کے لئے کوئی اچھا کتب خانہ تک نہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ عربی تعلیم کے لئے ایسا سرمایہ جمع کرنے کی کوشش بارور ہو سکے جو اب تک انگریزی تعلیم کے لئے بھی نہیں ہو سکی"

وہ نفس تجاویز کے مخالف نہ تھے۔ عربی ہی نہیں بلکہ فارسی اور سنسکرت کو بھی ضروری جانتے تھے۔ مگر اُن کے نزدیک اس کے لئے وہ وقت مناسب تھا جبکہ کالج کو یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچانے کے لائق تمام سامان جمع ہو جائے۔

ان ہی مضامین کے سلسلہ میں اپنی تمہیدوں کے ساتھ سرسید کے وہ مضامین بھی شائع کئے جو انھوں نے اس وقت لکھے تھے جبکہ ۱۸۸۲ء میں پنجاب میں مشرقی علوم کی تعلیم کے لئے اورنٹیل یونیورسٹی قائم ہونے والی تھی اور ۱۸۸۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے قائم ہونے کے وقت مشرقی تعلیم پر زور دیا جانے والا تھا ان کے علاوہ مسلمان ماہرین تعلیم اور قابل قابل اصحاب کی رائیں بھی شائع کیں اس تحریک کی حمایت مسٹر ہارٹسین اور مسٹر براؤن نے بہت زیادہ کی تھی۔

(دیکھو ضمیمہ)

نواب صاحب نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"ہم اپنے دوستوں کا جو ہمارے آبا و اجداد کے علم و فضل کی یاد دلا کر ہم کو بھی ان کی راہ پر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں صدق دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور ہم بھی خوب سمجھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ایسی نصیحتیں نہایت خوش معلوم ہوتی ہیں مگر عمل کرنا مشکل ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مگر ہم کو نہ پچھلے زمانہ کی یاد دلانے کی ضرورت ہے نہ علم کو فقط علم کے لئے تحصیل کرنیکی نصیحت کرنے کی حاجت اس لئے کہ ہم بھی یہ جانتے ہیں اور ہم کو اپنے بزرگوں کے یہ قول یاد ہیں کہ "دل بغیر علم کے ایسا ہے جیسے جسم بغیر روح کے" اور "عزت دولت میں نہیں بلکہ علم میں ہے" بس ہم کو یہ بتانا کہ ہمارے بزرگ علم کو علم کے لئے حاصل کرتے تھے فضول ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم کو یہ بتایا جائے کہ جس زمانہ میں ہمارے بزرگوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا تھا اور علم کو دولت پر ترجیح دی وہ زمانہ کیا تھا اور جو لوگ علم کو علم کے لئے حاصل کرتے تھے اُن کو دنیاوی فراغ، دنیاوی عزت، دنیاوی وجاہت اور دنیاوی دولت کہاں تک حاصل تھی اور اُن کا دل و دماغ پیٹ کے پالنے سے کہاں تک فارغ تھا اور اُن کی جسمانی زندگی روحانی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کہاں تک آمادہ تھی۔

جس زمانہ کی ہم کو یاد دلائی جاتی ہے وہ زمانہ وہ تھا جبکہ ہمارے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا دنیا کے بڑے حصہ پر حکمراں اور فرمانروا تھے سلطنت، دولت، حکومت، عزت ثروت ہمارے ہی حصہ میں تھی انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ہم ترقی کر رہے تھے ہم کو ہر قسم

(نوٹ صفحہ گزشتہ) مسٹر ماریسن نے اسی سلسلہ میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کو اس بیسویں صدی میں ان علوم و فنون کی ضرورت نہیں ہے جس سے وہ کسی پیشہ کی قابلیت حاصل کریں اور وہ بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، اور انجینیر ہو جائیں۔ بلکہ ان کو ایسے تعلیم کی ضرورت ہے جس سے ان کے خیالات بلند اور دماغ وسیع اور دل پاک ہوں اُن میں شریفانہ مقاصد اور پبلک کے فرائض انجام دینے اور بے غرضانہ نیکی کرنے کا خیال ہو تاکہ وہ اپنی قوم کی خدمت کر سکیں اور ان کو فائدے پہنچا سکیں۔

کی ترقی کرنے کے وسائل مہیا تھے سلطنت سے زیادہ علم کی عزت اور قوت تھی سلاطین سے بڑھ کر علماء پبلک کی نظر میں معزز و ممتاز تھے۔ علماء اور مشائخ کے آستانے سجدہ گاہِ خلائق تھے امیر و وزیر اُن کی مگس رانی اور دربانی کو اپنا فخر اور اپنی عزت سمجھتے تھے جو عالم زیادہ تارک الدنیا اور دنیا کی دولت و ثروت سے زیادہ متنفر ہوتے تھے انہی کی زیادہ قدر و منزلت ہوتی تھی، دنیا کی ساری عزتیں ترک دنیا کی وجہ سے انہیں حاصل ہوتی تھیں۔ عزت وجاہ کا وہ سامان اُن کو مہیا تھا جس کے سامنے دنیا اور اس کی دولت و ثروت ہیچ سمجھی جاتی تھی۔ سلطنت اور پبلک ان کے تمام ضروری معیشت کے اسباب مہیا کرنے کی کفیل تھی اور نذر و نیاز تحائف و ہدایا کے افراط سے ان کو کسی قسم کی دولت جمع کرنے کی حاجت نہ تھی۔ علم کا علم کے لئے ہی حاصل کرنا ہی ایک بہت بڑا ذریعہ عزت وجاہ کے پیدا کرنے کا تھا بس ایسے زمانہ میں ہمارے آبا و اجداد کا علم کو علم کے لئے حاصل کرنا زیبا تھا۔

مگر ہمارا موجودہ زمانہ کیسا ہے ادبار کی گھٹا سر پر چھا رہی ہے افلاس نے بڑے بڑوں کی بری گت بنا رکھی ہے رزق کے دروازے بند ہیں پہننے کو کپڑا کھانے کو روٹی ملتی نہیں چاروں طرف الجوع الجوع کی صدا آرہی ہے معاش کی فکر نے عقل، ایمان، عزت حمیت سب کو خیرباد کہدیا ہے مفلسی نے ذلیل سے ذلیل حرکتیں کرنے اور بڑے سے بڑے جرایم کے ارتکاب پر مجبور کر دیا ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں شریف عالم فاضل اور عالی خاندان مسلمان ایسے ہیں جن کو سوائے پیٹ بھرنے اور روزی پیدا کرنے کے دوسرے خیال کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی ہے ان کی حالت تو یہ ہو رہی ہے ؎

شب چو عقدِ نماز بر بندم

چہ خورد بامداد فرزندم

ایسی صورت میں اُن سے یہ کہنا کہ علم کو علم کے لئے حاصل کرو تاکہ روحانی خوشی حاصل ہو تم کو روپیہ پیدا کرنے اور پیٹ بھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ درحقیقت ایک بے دردانہ اور تعجب انگیز

نصیحت ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے اب بات پر بحث کی کہ:-

" علم کو شوقِ حق اور ذوقِ علم کے لئے سیکھنا جھوٹا دعوے ہے اور نہ کسی زمانہ میں اور نہ کسی جگہ صرف اس مقصد کے لئے حصول علم کیا گیا بلکہ اولین مقصد اپنی زندگی اور اوقات بسری کے ذرائع پیدا کرنا ہیں اور فضائل اخلاق کا پیدا ہونا اس کا لازمی اثر ہیں۔"

نواب صاحب کی مختتم رائے

اس مضمون کے بعد انہوں نے عرصہ تک اس سلسلہ کو قائم رکھا۔ مشرقی و مغربی تعلیم کے اثرات رقم مطلوبہ کی عدم فراہمی کے امکانات وغیرہ پر بحثیں کیں اور آخر میں انہوں نے اپنی مختتم رائے اس طرح ظاہر کی:-

" اگرچہ ہم نے ان تین آرٹکلوں میں سرسید کے خیالات طالبعلموں کی طبائع کا میلان عربی تعلیم کی ضرورت ظاہر کر دی ہے لیکن اب ہم صاف صاف مختصر لفظوں میں اپنی رائے اور اپنی خواہش اور اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں ہم کو ان اپنے دوستوں کی طرف سے جنہوں نے عربی کے زندہ کرنے کی تجویزیں پیش کی ہیں کسی قسم کی بدگمانی نہیں ہے بلکہ ہم صدق دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نزدیک صرف ہماری قوم کی ترقی بہبودی کے خیال سے یہ تجویز پیش کی ہے۔

ہم عربی کی تعلیم کو بحیثیت سکنڈ لینگویج کے اپنے کالج میں ترقی دینا پسند کرتے ہیں اور اسے ضروری اور مفید سمجھتے ہیں اور اس کے لئے ہم مسٹر مارین کی پہلی تجویز کو کہ ایک ہندوستانی عالم اور ایک مصری عالم بلایا جائے پسند اور منظور کر چکے ہیں۔

ہم ایسی عربی درسگاہ کا علی گڑھ میں قائم ہونے کی ضرورت نہیں دیکھتے جس میں صرف عربی تعلیم ہو یا انگریزی بی اے سے کم درجہ کی رکھی جائے نہ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی درسگاہ کے لئے کافی طالب علم جمع ہو سکیں گے اور اگر اس کے لئے روپیہ قوم سے مانگا جاوے تو اُسے کالج کی ترقی اور یونیورسٹی بنانے کی اصلی تجویز کا بڑا مانع اور مزاحم اور قوت کا منتشر کرنے والا سمجھیں گے یورپ عربک

پروفیسر بلانے کی بالفعل ہم کو استطاعت نہیں ہے نہ جب تک انگلش ایجوکیشن کے لئے اور دو یورپین پروفیسر رکھنے کے لئے ہم مستقل آمدنی پیدا کرلیں۔ عربی تعلیم کے لئے کوئی یورپین بلا سکتے یا بلانا پسند کرتے ہیں۔

اگر گورنمنٹ اپنی مہربانی سے ایک یورپین پروفیسر اپنی طرف سے ہمارے کالج کو دے تو ہم نہایت شکرگزاری کے ساتھ منظور کریں گے بشرطیکہ کسی قسم کی قید و شرط نہ لگائی جائے اور ایم اے کلاس کی تعلیم ہمارے کالج میں صرف عربی پر محدود نہ کی جائے بلکہ دوسرے مضامین کے لئے بھی ایم اے کا دروازہ کھلا رہے اور عربی مثل دیگر مضامین کے اختیاری ہو نہ جبری ہم کو امید ہے کہ ہماری اس تحریر سے ہمارے دوست بھی غور و تامل کے بعد متفق ہوں گے اور ہماری رائے کو اپنی رائے سے زیادہ مخالف نہ پائیں گے اور ہماری ضرورتوں پر خیال کر کے وہ انگریزی تعلیم کی تکمیل کو دوسری تعلیم پر مقدم سمجھیں گے اور یونیورسٹی کے لئے دس لاکھ روپیہ جمع ہونے سے پہلے وہ صرف عربی کے لئے پانچ لاکھ روپیہ جمع کرنے کا خیال دل میں نہ لائینگے اگر ایسا نہ ہوا تو ہم بھی کہیں گے کہ جو مرحوم سرسید نے کہا تھا "ہم کو افسوس ہے کہ نیک نیت کوششیں جو قبل از وقت قوم کے بزرگ دوسرے قسم کے خیالات سے کرتے ہیں وہ سب ضائع ہو رہی ہیں یا قوم کے عروج کے لئے سب بے سود ہیں۔"

فیصلہ غرض یہ اتنا اہم اور پیچیدہ مسئلہ تھا کہ عرصہ تک نواب صاحب اس کی الجھنوں کو دور کرنے میں مصروف رہے اور چونکہ گورنمنٹ کا رجحان بھی اسی طرف تھا اس لئے ٹرسٹی بھی آزاد و صاف رائے دیتے ہوئے ہچکچاتے تھے اس نئی مشکل کو ہز ہائی نس آغا خاں کی تائید نے اور بھی زیادہ وقعت دیدی اور اپنی تائید کو کامیاب کرنے کے لئے انہوں نے دبے الفاظ میں یہاں تک دھمکی دیدی کہ اگر یہ اسکیم منظور نہ کی گئی تو اپنی امداد بند کر دیں گے لیکن نواب صاحب نے اس دھمکی کو بھی قبول نہیں کیا بالآخر سرجیمس کے مبارک ہاتھوں سے یہ عقدہ حل ہو گیا گورنمنٹ کی پالیسی میں بھی تبدیلی ہو گئی اور ہز آنر بہ نفس نفیس کالج میں تشریف لائے اور ٹرسٹیوں سے پرائیوٹ گفتگو کی اور ان غلط فہمیوں کو دور کیا جو گورنمنٹ کی حمایت تعلیم عربی سے پیدا ہو رہی تھیں انہوں نے

صاف طور سے کہدیا کہ انگریزی تعلیم کو کم کرکے عربی تعلیم قائم کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور ہرگز عربی کی تعلیم لازمی اور جبری قرار نہیں دی جائے گی آخر میں شرائط طے ہو کر یہ قرار پایا کہ عربک پوسٹ گریجویٹ ایجوکیشن کا درجہ قائم کیا جائے تاکہ جو مسلمان طلبا گریجویٹ بننے کے بعد عربی کی تعلیم حاصل کریں وہ معقول وظیفہ لیکر سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھ سکیں گورنمنٹ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کی مدد کرلینے کی پالیسی کے لحاظ سے انگریزی پروفیسر کا خرچ اُٹھائے اور کالج اور پرائیوٹ عالی حوصلہ حضرات عربی وظائف کا خرچ ادا کریں۔ اس مسئلہ کے حل میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (مرحوم) اور نواب صدر یار جنگ کی خدمات

ندوہ کی تائید

نواب صاحب نے اگرچہ محمدن کالج میں عربی تعلیم کی اسکیم کی سخت مخالفت کی تھی لیکن وہ دراصل عربی تعلیم کے مخالف نہ تھے اُنہوں نے ہمیشہ اسلامی مدارس کو عزت کی نظر سے دیکھا اور باوجود تباین خیالات وہ علماء کا احترام کرتے۔ راقم کتاب نے خود مولانا لطف اللہ صاحب (علی گڑھ) اور مولوی عبدالحق صاحب دہلوی کے تعلقات اور احترام کو مشاہدہ کیا ہی یہ ضرور ہے کہ وہ عربی مدارس میں ایک اصلاح شدہ نصاب کے خواہاں اور علماء میں زمانۂ حال کی روشنی دیکھنے کے متمنّی تھے۔

کانفرنس میں دارالعلوم ندوہ کی تحریک

جب مولانا محمد علی مرحوم اور چند دیگر علمائے تعلیم عربی کی اصلاح نصاب کرکے ندوہ کی بنیاد ڈالی تو نواب صاحب نے اجلاس کانفرنس منعقدہ ۱۸۹۴ء میں اس کی حمایت میں ایک رزولیوشن پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"جو رزولیوشن اس وقت میں نے پیش کیا ہے مجھے امید ہے کہ اُس کا نہایت خوشی سے خیر مقدم کیا جاوے گا اور ہر ایک کے دل سے بے اختیار **ذالک ما کنا نبغ** کا نعرہ نکلے گا اس لئے کہ آپ لوگ چند سال سے جس ضروری اور مفید کام کے لئے سعی کر رہے ہیں اُس کے پورے ہونے کی اب امید ہوتی ہے اور ہمارے اقبال کا ستارہ جو ڈوب رہا تھا وہ پھر اُٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ بعض لوگ میرے اس رزولیوشن کے پیش کرنے اور ندوۃ العلماء کی تائید پر تعجب کریں گے اور مجھے مغربی علوم وفنون کی اشاعت

کرنے والے فرقہ کا نقیب اور نئے خیالات پھیلانے والے لشکر کا عَلَم بردار سمجھ کر ندوۃ العلما کی حمایت کرنے پر حیرت کی نگاہ سے دیکھیں گے مگر میں ابھی اُس حیرت اور تعجب کو دور اور اپنے اس رزولیوشن کے پیش کرنے سے قومی ترقی کی خواہش اور تائید کا ایک تازہ ثبوت پیش کروں گا۔"

مسٹر انٹونی میکڈانلڈ کی غلط فہمی کا جواب

جب ہز آنر سر انٹونی میکڈانلڈ نے ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم کے ایڈریس کے جواب میں یہ نصیحت کی کہ:۔

"آپ کے مطالب کی تکمیل بوجہ احسن اپنی ذات پر بھروسہ کرنے اور اپنے کو اُن ہتھیاروں سے مسلح کرنے سے ہوگی جو زمانۂ حال کی تعلیم کے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ آپ کو کفر والحاد کے الزام کے اندیشہ سے یا ندوہ کی اس خواہش سے کہ آپ پرانے قاعدوں پر قائم رہیں اپنے پچھلے مقصد میں منحرف ہونا مناسب نہیں ہے۔ قومی اصلاح اس طریقہ سے نہیں ہوتی ہے اور زمانۂ حال کی لڑائی جدید ہتھیاروں کے ذریعہ سے لڑنا چاہیئے۔"

تو نواب صاحب نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ہز آنر کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ایک مدلّل اور پُرزور مضمون شائع کیا جس میں سر سید اور سید محمود کی تائیدی تقریروں کے بھی حوالے تھے۔

پھر ۱۹۰۲ء میں اُنہوں نے یونیورسٹی کمیشن میں جو شہادت دی تو اُس میں بھی ندوۃ العلمأ کے کام کا تذکرہ کیا۔

کمیٹی تحقیقات تعلیم دینیات کا تقرر اور تعلیم دینیات کی حمایت

نواب صاحب اگرچہ تعلیم جدید کے بڑے منّاد اور زبردست حامی تھے لیکن ساتھ ہی مسلمانوں میں وہ اسلامی روح قائم رکھنے اور اسلامی جوش برقرار رہنے کے سب سے زیادہ متمنّی اور خواہاں تھے اُنہوں نے ۱۹۰۵ء میں تحقیقاتِ تعلیم دینیات کے لئے ایک کمیٹی قائم کی تھی جس نے پوری تحقیقات کے بعد ایک رپورٹ تیار کی ان کا ارادہ تھا کہ اس کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق انتظام کیا جائے ان کی تجویز تھی کہ چونکہ کالج کلاسوں کے طلبا کی جو جدید فلسفہ اور جدید سائنس کی تعلیم پاتے ہیں مرّوجہ کتب دینیات سے تسکین نہیں ہوتی اس لئے علماء مصر کی اُن کتابوں سے فائدہ اُٹھایا جائے جو اُنہوں نے جدید

طریقہ کے ساتھ ایسے طالبان علم کے لئے تالیف وتصنیف کرنی شروع کی ہیں لیکن ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء کے حالات وواقعات نے اس ارادہ کے پورا کرنے کی مہلت نہ دی اگرچہ باقاعدہ تعلیم مذہبی کی کوئی اصلاح اُن کے زمانہ میں نہیں ہوئی لیکن وہ اپنی تقریروں میں ابتداء سے ہی طلبا کی توجہ مذہب کی طرف رجوع کرانے میں ساعی رہتے تھے وہ اپنی تقریروں میں ہمیشہ مذہب کی عظمت وحرمت کے خیال کو طلبا کے دل ودماغ پر مرتسم کرنے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

طلباء کو مذہب کے متعلق نصائح

۱۸۹۳ء میں جب وہ حیدرآباد سے واپس آئے ہیں تو اسی زمانہ میں نہایت شان کے ساتھ کالج میں مجلس میلاد منعقد ہوئی تھی اس مجلس کے بعد نواب صاحب نے ایک نہایت فصیح اور پُرجوش تقریر طلبائے کالج کے مذہبی جوش اور مذہبی حالت کے متعلق کی تھی اس میں اُنہوں نے عام تعلیم اور مذہبی تعلیم پر زور دینے کے بعد کہا تھا کہ:۔

"اگر تمہارے ذہن میں اسلام کی سچائی کا یقین نہ رہے اور تم اپنے مذہب پر قائم نہ رہو اور جیسے کہ نام اور صورت کے مسلمان ہو تو تمہارے علم سے جہل اچھا تمہاری تہذیب سے بے تہذیبی بہتر بلکہ سچ پوچھو تو تمہاری زندگی سے قوم کے لئے تمہاری موت اچھی کیا خوشی ہو سکتی ہے ہم کو اس سے کہ تم عالم ہو گئے حکیم اور فلسفی بن گئے دنیا کے سارے علوم سیکھ لئے یورپ کی نئی تحقیقاتوں اور یونان کے پُرانے علموں میں اُستاد ہو گئے۔ مگر مسلمان نہ رہے اور مسلمانی چھوڑ بیٹھے جبکہ تمہارے دل میں اسلام ہی نہ رہا تو قوم تم پر کیا فخر کرے گی۔ تمہارا نام علماء اور حکماء میں دیکھکر تمہارے بزرگ کیا خوش ہوں گے تمہارے گلے میں خطابی تمغوں کے ہار پڑے ہونے سے کیا کوئی باپ اپنے بیٹے کو گود میں بٹھاتا ہے جبکہ اس کی جان نکل گئی ہو گو وہ کیسا ہی خوبصورت اور پیارا کیوں نہ ہو پس اسلام تمہاری جان ہے اس کے بغیر کوئی کیسا ہی عالم وفاضل کیوں نہ ہو جائے وہ ایک جسم ہے مٹی میں دبانے کے لائق اور ایک نعش ہے زمین میں چھپانے کے قابل۔"

اسی طرح اور بھی متعدد موقعوں پر اُنہوں نے طلبائے کے دل میں مذہبی عظمت جاگزیں کی

اکثر تعلیم یافتہ اصحاب طفولیت میں مذہبی تعلیم کو ایک فضول کام، تضیع اوقات اور دماغ پر ایک ناقابل برداشت بار سمجھتے ہیں اور اس کو سنِ شعور پر ملتوی رکھتے ہیں لیکن نواب صاحب بچپنے میں مذہبی تعلیم کے سخت موید تھے! اور اسی عنوان سے انہوں نے ایک مدلل و مطول مضمون بھی لکھا تھا جس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمارے نزدیک بچوں کو مذہبی تعلیم نہ دینا ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی بھی ممکن نہیں ہو سکتی اور ہم نہیں سمجھتے کہ جو لوگ اپنے مذہب کو سچا جانتے ہیں اور کسی مذہب کے صدق دل سے معتقد ہیں وہ اپنے بچوں کو اُسی عمر میں جبکہ وہ ہر چیز کو اچھی طرح سیکھ سکتے ہیں مذہبی تعلیم سے کیوں محروم رکھیں"۔

پھر دنیاوی تعلیم کی ضرورت و غایت اور بغیر مذہبی تعلیم کے اخلاقی خوبیوں کے عدم امکان پر بحث کر کے لکھتے ہیں کہ:۔

"مذہبی آدمی خصوصاً مسلمان مذہبی تعلیم کو دنیاوی تعلیم سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں اور جو لوگ ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں اُن پر تو لازم ہے کہ بچپنے میں ہی لڑکے کو مذہبی تعلیم دلائیں کیونکہ اس وقت طبیعت اس کی مثل پودے کے نازک ہوتی ہے اگر پہلے ٹیڑھا ہو جائے تو پھر بڑا ہو کر سیدھا نہیں ہو سکتا۔ چھوٹی عمر میں نصیحت اور تعلیم کا گہرا اثر دل پر ہوتا ہے اور نیکی دل میں آتی ہی مثلاً اپنے خدا کو حاضر و ناظر جاننا اُس کو قادر اور مالک سمجھنا، نیکی کے فائدے گناہ کی برائیاں عقبیٰ کے حالات جزا و سزا کے خیالات بچپن ہی سے دل میں نہ بیٹھیں تو بڑا ہو کر وہ بے ایمان رہتا ہے برائیوں اور گناہوں میں مبتلا رہا کرتا ہے اور وہ کجی جو اُس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے وہ بڑے درخت کی کجی کے مانند کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔

. . . . مگر جوان ہو کر مذہبی تعلیم کا خیال کرنا غلط ہے اس لئے کہ جب عمر کا اصلی حصہ ایسی باتوں کے دیکھنے میں گذر گیا جس میں مذہب کا کچھ اثر دل پر نہ ہوا اور مذہب کی باتیں ہی نہ سنی ہوں اور وہ خیالات جو مذہب کے خلاف ہیں دل میں بیٹھ گئے ہوں اس کے بعد

مذہبی تعلیم حاصل کرنا یا مذہب کو تحقیق کر کے اس کا اختیار کرنا ناممکن ہے .... کیا کوئی سمجھدار آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ جب لامذہبی کے خیالات دل میں جم گئے ہوں یا مذہب کی کوئی بات بچپنے میں نہ سُنی ہو وہ جانتے ہی نہ ہوں کہ خدا کیا ہے رسول کون ہے نماز کسے کہتے ہیں روزہ کیا چیز ہے؟ اگر جانتے ہو تو یہ کہ یہ سب باتیں لغو اور خرافات اور فضول اور بے سود ہیں، خدا کہاں ہے، رسول کون ہے؟ نماز میں اُٹھنا اور زمین پر سر رگڑنا وحشیانہ حرکتیں ہیں حشر و نشر سزا و جزا کے خیالات بچوں کے بہلانے اور ڈرانے کی باتیں ہیں انسان صرف اسی دنیا کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ مادّے سے بنا ہے روح جسمانی ترکیب کا کیمیائی نتیجہ ہے۔ مرنے کے بعد کیا جینا اور کہاں کی دوزخ اور کہاں کی بہشت، یہ سب جہالت کی باتیں ہیں ایسے خیالات جبکہ دل میں بیٹھ جائیں تو پھر کیا ممکن ہے کہ کبھی وہ دل سے نکل سکیں گے یا کبھی ایسے لوگوں کو مذہب کا خیال پیدا ہوگا اور وہ مذہب الٰہی دریافت کرنے کا ارادہ کریں گے۔ جب کہ مذہب کے نام ہی سے ان کو نفرت ہوگی تو وہ کیونکر تحقیق کرنے کا خیال کرینگے۔"

غرض اُنہوں نے ہر موقع پر مذہبی تعلیم کی ترغیب دلائی اور اُس کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا۔

انجمن الفرض

ڈیوٹی یا انجمن الفرض کے قیام کا سہرا اگرچہ آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب[1] کے سر ہے جسے انہوں نے بزمانۂ طالب علمی قائم کیا تھا۔ لیکن اس کا دائرہ حدود کالج تک محدود تھا اور وہ صرف ایک دکان تھی جس میں اسٹیشنری، قومی لٹریچر اور طلباء کی ضروریات کا سامان فروخت ہوتا تھا اور دوسرے طریقوں سے بھی طلباء کچھ روپیہ جمع کر لیتے تھے مگر نواب محسن الملک نے اس کو مبلّغین اور محصّلین کی ایک جماعت بنا دیا وہ قابل طلباء کی جماعتیں بناتے اور اطراف و اکناف ہند میں بھیجتے یہ جماعتیں جہاں جاتیں نواب صاحب وہاں کے سربرآوردہ بااثر اور قومی کام کرنے والوں کے نام تعارفی خطوط دیتے طلباء کالج کے اثرات قائم کرتے

[1] سابق وائس چانسلر۔

اور ہزاروں روپیہ جمع کر کے لاتے چنانچہ جب ۰۵-۱۹۰۴ء میں ان ڈپوٹیشنوں نے ۳۲ ہزار روپیہ جمع کیا تھا۔ سر شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا (لاہور) نے سرسید کی برسی کے موقع پر اپنی تقریر میں بالکل صحیح کہا تھا کہ "جتنا روپیہ اب کالج کے طالب علم جمع کر لاتے ہیں اتنا روپیہ خود سرسید پنجاب میں آ کر زندہ دلوں کے گروہ سے لے جاتے تھے"

اس ریمارک کی واقعیت کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ۱۹۰۱ء سے ۰۸-۱۹۰۷ء تک ۱۱۸۰۰۴ طلبا کے وفود نے جمع کیا۔

اس ریمارک کی واقعیت کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ۱۹۰۵ء تک سید مصطفٰے حسین صاحب رضوی بی اے نے پچھتر ہزار ڈاکٹر سید محمود پی ایچ ڈی نے پچیس ہزار اور تصدق احمد خاں صاحب شروانی بی اے بیرسٹر ایٹ لا نے اکیس ہزار روپے جمع کر کے انجمن الفرض کو دئے تھے۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کالج کے ساتھ سابق طلباء کی توجہ اور دلچسپی قائم رکھنے کے لئے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم کرائی اس کے سالانہ جلسوں میں پُرجوش تقریریں کیں ان کو انتظامات کالج میں شریک کیا اور باوجودیکہ اکثر طلباء قدیم ٹرسٹیوں کی جماعت میں شریک تھے لیکن ایسوسی ایشن کے وقار کو مضبوط کرنے کے لئے ۱۹۰۷ء میں چند شرائط کے ساتھ یہ حق بھی دیا گیا کہ وہ زمرۂ ٹرسٹیان میں ہر سال ایک قدیم طالب علم کو ۳ سال کے لئے بطور اپنے قائم مقام کے منتخب کرے یہ جماعت روز بروز مضبوط و قوی ہوتی گئی اور چھ ہزار روپیہ سالانہ پرنس آف ویلز اسکول کے لئے اس نے اپنے فنڈ سے منظور کئے۔

کالج ایسوسی ایشن[1] ان ہی کی رائے مصلحت اندیش نے لندن میں جبکہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب تعلیم پا رہے تھے ایک مجلس اینگلو اورنٹیل علی گڑھ کالج ایسوسی ایشن قائم کرائی جو سالانہ اور جب ضرورت ہو اپنے جلسے منعقد کر کے علی گڑھ کے مقاصد کی تبلیغ کرتی ہے اس کے جلسوں میں ہندوستان کے پنشن یافتہ انگریز اور ہندوستانی طلباء اور وہ معزز اصحاب جو انگلستان میں مقیم ہوتے تھے شرکت کرتے تھے اگرچہ اس سوسائٹی سے کالج کو کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچا لیکن اس میں شک نہیں کہ زبردست

---

[1] اب مدت سے اس ایسوسی ایشن کا عدم وجود برابر ہے۔

اخلاقی فوائد حاصل ہوئے۔

پرشین ڈپوٹیشن ۱۹۰۳ء میں ایک ڈپوٹیشن ایران بھیجا گیا جو دو اُستادوں اور دو طلبا پر مشتمل تھا مولوی سید حسن عسکری صاحب جو علی گڑھ میں تعلیم دینیات اہلِ شیعہ کے لئے مقرر تھے مستعفی ہو کر شیراز گئے تھے اور انہوں نے وہاں سے لکھا تھا کہ:-

"یہاں تعلیم بہت کم ہے اور کوئی درس گاہ ایسی نہیں ہے کہ موجودہ ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تعلیم دے سکے اور بعض ایرانی انگریزی اور علوم جدیدہ سیکھنا چاہتے ہیں اور ہندوستان جانے پر بھی آمادہ ہیں اگر علی گڑھ کالج سے کوئی ڈپوٹیشن یہاں بھیجا جائے تو اس کا بہت اثر ہوگا اور غالباً کچھ لوگ انگریزی تعلیم کے لئے وہاں جانے پر آمادہ ہو جائیں گے۔"

مسٹر ماریسن نے اس تحریک کا ویسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری سے تذکرہ کیا انہوں نے پسند کیا اور گورنمنٹ سے ڈپوٹیشن کے ممبروں کی حفاظت جان کا بھی انتظام ہو گیا اور کسی قدر اعتراض کے ساتھ ٹرسٹیوں نے بھی اس تجویز کو منظور کر لیا۔ چنانچہ یہ ڈپوٹیشن ایران پہنچا اور ۱۲ طلبا خاندان شاہی اور خاندانِ امراء کے کالج میں داخل ہونے کے لئے ڈپوٹیشن کے ساتھ آئے۔

ڈپوٹیشن کا سیاسی رنگ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اسلامی ملک سے جہاں تعلیم بالکل ابتدائی حالت میں ہو کالج میں نوجوانوں کو تعلیم کے لئے لانا کالج کے عالمگیر اثر قائم کرنے کے لئے نہایت شاندار کام تھا اور اس کو بھی نواب صاحب کے زمانہ کا ایک اہم واقعہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن بعض سیاست دانوں کے نزدیک جس طرح لارڈ کرزن کا دورۂ خلیج فارس ایک سیاسی مقصد تھا اسی طرح اس ڈپوٹیشن کی روانگی کی بھی غرض سیاسی تھی اس رائے کو مسٹر ماریسن کے گورنمنٹ سے بالا بالا معاملات طے کر لینے سے اور بھی تقویت ہو گئی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اس مفید اور قومی انجمن کا قیام اگرچہ ۱۸۸۶ء میں ہوا تھا اور بلا شبہ

ا؎ میر ولایت حسین صاحب بی اے سکنڈ ماسٹر، سید جلال الدین صاحب ایم اے ٹیچر، سید ابو محمد صاحب ایم اے اور جمیل احمد صاحب (طلبا)

اُس نے بڑی حد تک مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کی اور خیالات کا رجحان ترقی تعلیم کی طرف کر دیا لیکن سرسید کی زندگی تک اس کا دائرہ صرف ممالک متحدہ و پنجاب تک محدود تھا اور اس کے کل گیارہ اجلاس دس صوبۂ متحدہ میں اور ایک پنجاب میں منعقد ہوئے تھے مگر نواب صاحب کی اَن تھک کوششوں اور سرگرمیوں نے اس کو تمام ہندوستان پر محیط کر دیا انہوں نے سرسید کے انتقال کے دو تین سال پہلے توجہ شروع کر دی تھی سرسید کے بعد جائنٹ سکرٹری کی حیثیت سے کوششوں کو اور وسیع کیا ۱۸۹۸ء میں لاہور میں کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی اور تین نہایت موثر اور دلگداز گشتی خطوط فارغ التحصیل طلباء بہی خواہان قوم اور مالکان و اڈیٹران اخبارات کو لکھے جن کی اشاعت نے توقع کے مطابق اثر ڈالا اخبارات نے خصوصیت کے ساتھ پُرزور مضامین لکھکر قوم کو مخاطب کیا اور امید و توقع سے بڑھ کر اجلاس کامیاب ہوا۔ پھر تو تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ عام مسلمانوں کی توجہ بھی اس تعلیمی مجلس کی طرف مائل ہو گئی اور تعلیمی ضرورت اور کسی تعلیم کا احساس ہونے لگا ان تمام اجلاسوں میں جو اس نو سال میں منعقد ہوئے ہر صوبہ کے تعلیم یافتہ اصحاب نے نمایاں حصہ لیا اور وہ باعتبار پیش شدہ مسائل اور مالی فوائد کے خصوصیت کے ساتھ مہتم بالشان تھے ہر ایک اجلاس میں یونیورسٹی کا مسئلہ زیر بحث رہا اور اُس پر نہایت مفید اور دلچسپ بحثیں رہیں۔ اور تعلیمی جمود ختم ہو کر نئی حرکت پیدا ہو گئی

کانفرنس کے اثرات پر ڈائرکٹر جنرل تعلیم ہند کی رائے

ان اجلاسوں اور ان کے اثرات کے متعلق تعلیم ہندوستان کے پانچویں پنج سالہ تبصرہ ۱۹۰۲ و ۱۹۰۷ء میں مسٹر اے ڈبلیو آرنج نے جو اس زمانہ میں ڈائرکٹر جنرل تعلیم ہند تھے تمہید کے بعد یہ رائے تجویز کی تھی کہ:-

"اس کے ذریعہ سے ہندوستان میں دور دراز اور بعید مقامات کے مسلمان اپنے ہم مذہب بھائیوں کی تعلیم کے متعلق اپنا فرض بہتر سمجھنے کے لئے بیدار ہو گئے ہیں اور تعصب کے دور کرنے اور تعلیم و ترقی کی خواہش مشتعل کرنے سے بیش بہا کام پورا ہو رہا ہے۔

چند یادگار اجلاس

۱۹۰۳ء کا اجلاسِ دہلی ایک قابل یادگار اجلاس تھا کیونکہ اسی زمانہ میں شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کا جشن تاجپوشی تھا۔ اس اجلاس میں نہ صرف مسلمان حامیان تعلیم نے شرکت کی بلکہ سلطنت انگلشیہ کے بڑے بڑے سول و فوج کے حکّام اور انگلستان کے نامور اصحاب بھی شریک ہوئے جن میں لارڈ کچنر کمانڈر انچیف سر مائیکل ہکس بیچ وزیر خزانہ لارڈ پیمبروک سر ام بہاؤنگری ممبر پارلیمنٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے اپنی تقریروں میں مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ ہمدردانہ خیالات ظاہر کئے۔

اس موقع پر ۱۲۷۲۸، بارہ ہزار سات سو اٹھائیس روپیہ چندہ بھی جمع ہوا۔

بمبئی میں کانفرنس کے انعقاد کو بلاشبہ نواب صاحب کی کرامت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مؤلف سوانح ان شدید تعصبات سے واقف ہے جو علی گڑھ کے خلاف وہاں کے تعلیم یافتہ اور بالخصوص طیّب جی کے خاندان میں تھے۔

سرسید ہمیشہ بمبئی میں کانفرنس کے انعقاد کی تمنا ہی کرتے رہے مگر نواب محسن الملک نے یہ کرامت دکھا دی۔

بمبئی کے اجلاس میں غلط فہمیوں کا ازالہ

اس اجلاس کے لئے بدرالدین طیب جی پریسیڈنٹ منتخب ہوئے تھے جو ہز ہائی نس آغا خاں سے دوسرے درجہ پر صاحب اثر تھے مگر ان کے خطبۂ صدارت سے علی گڑھ کے متعلق کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئیں اور ڈیلیگیٹوں اور پریسیڈنٹ میں یونیورسٹی کے مسئلہ پر یک گونہ بدمزگی بھی پیدا ہو گئی تھی جس کو نواب صاحب نے نہایت پُرلطف طریقہ سے دور کر دیا اور اپنی آخری تقریر میں ان تمام غلط فہمیوں کو مٹا دیا اور خود پریسیڈنٹ کو اپنے طرز عمل کی علی الاعلان تلافی کرنی پڑی۔ اگرچہ اس اجلاس میں بمبئی کے مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے مالی طور پر چنداں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اخلاقی طور پر اجلاس بہت کامیاب ہوا۔ جمود و سکوت قومی حرکت میں مبدل ہو گیا آئندہ فوائد کی جو بعد کو بمبئی سے حاصل ہوئے ایک بنیاد قائم ہو گئی اور علی گڑھ کی طرف طبائع میں میلان پیدا ہو گیا۔

لکھنؤ میں عطیات کی بارش

اس کے بعد لکھنؤ میں جہاں طبقۂ علمار کی ایک سخت اور شدید مخالفت کے بعد کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا یونیورسٹی کے مسئلہ پر کافی غور ہوا اور قرار پایا کہ اس کی تکمیل کے لئے اولاً چند شاخوں کو لیا جائے چنانچہ اس کی ابتدا شاخ عربی سے کی گئی اور اس مد میں سر راجہ تصدق رسول خاں صاحب تعلقہ دار جہانگیر آباد نے بیس ہزار روپیہ عنایت کئے اسی کے ساتھ شاخ سائنس کے لئے سر راجہ محمود آباد نے پینتیس ہزار مرحمت فرمائے۔

علیا حضرت سرکار عالیہ فرمانروائے بھوپال دام اقبالہا کی ایک سو روپیہ کی ماہوار کی امداد زنانہ نارمل اسکول کو حاصل ہوئی اور نواب ممتاز الدولہ سر فیاض علی خاں نے بیس ہزار روپیہ لاٹوش بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے لئے عطا کئے غرض ایک لاکھ سات ہزار سات سو بانوے روپیہ چندہ ہوا جس میں اُن امرائے جلیل القدر کے چندوں کے ساتھ غریبوں کے دو روپیہ تک کا چندہ تھا۔

ایسے چندوں کے علاوہ علی العموم غیر مستطیع طلبار اور ان صوبوں کے طلبار کے لئے جہاں اعلیٰ تعلیم کی کمی تھی خاص طور پر چندے کئے جاتے اور ہر چندے میں نواب صاحب بذات خاص بھی شریک ہوتے چنانچہ کلکتہ میں اس قسم کے چندہ کی مقدار ہمہ کمالہٗ تین ہزار سات سو بائیس تھی اور رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے لئے علاوہ بریں تھے۔

ہر اجلاس میں نواب صاحب کی متعدد تقریریں ہوتی تھیں اور کوئی تقریر خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہوتی غیر مؤثر نہ رہتی۔

غرض ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۶ء تک نو اجلاس منعقد ہوئے۔ کلکتہ، ڈھاکہ، مدراس اور بمبئی میں ایک ایک صوبۂ پنجاب میں دو اور صوبۂ متحدہ میں تین۔

کانفرنس میں جس قدر تقریریں اور لکچر ہوئے اور یونیورسٹی اور تعلیمی مسائل پر جو بحثیں کی گئی ہیں اگر ان سب کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھا جائے تو تعلیم اور خاص کر مسلمانوں کی تعلیم کا وہ گرانقدر لٹریچر ملے گا جو بجز ان اوراق کے کسی اور جگہ نظر نہیں آسکتا۔

علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کا دوبارہ اجرا اور اس کے مضامین

۱۸۶۶ء میں سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو جاری کر کے اُردو اخبار نویسی کی ایک عمدہ مثال قائم کی تھی اور اس سے پہلے کوئی ایسا اُردو اخبار نہ تھا جو معیار اخبار نویسی پر پورا اترتا۔ مگر سرسید کے انتقال کے بعد ہی اخبار بند ہو گیا اور جنوری ۱۹۰۱ء تک بند رہا لیکن چونکہ علی گڑھ کالج کی طرف قوم کو متوجہ کرنے اور اس مرکز تعلیم کے صحیح حالات اور قوم کی سیاسی و معاشرتی اور تمدنی و تعلیمی ضروریات کی اشاعت کے لئے ایک آرگن کی شدید ضرورت تھی اس لئے نواب صاحب اور ان کے چند احباب نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا دوبارہ اجرا ضروری سمجھا۔ کالج فنڈ سے سو روپئے ماہوار منظور کئے گئے۔ اس غرض کے لئے کچھ عطیات بھی حاصل ہوئے اور سلسلہ جدید کا پہلا نمبر ۱۲ فروری ۱۹۰۱ء کو نواب صاحب کی اڈیٹری میں شائع ہوا اور ہر لحاظ سے روز بروز ترقی کرتا رہا۔ اس میں تعلیمی مضامین کے علاوہ تمدنی و معاشرتی اور اہم سیاسی مضامین کا بھی کافی حصہ ہوتا تھا اور اس کے اڈیٹوریل آرٹیکل نہایت زبردست اور مدلل ہوا کرتے تھے۔

اگرچہ اس کی آمدنی اتنی نہیں ہوئی کہ وہ اپنے اخراجات کو خود برداشت کرتا لیکن زیادہ نقصان بھی نہیں رہا اور اس سے جو اخلاقی فوائد مترتب ہوئے دوسری صورتوں میں کثیر اخراجات سے بھی حاصل نہ ہوتے۔

تعلیم نسواں

نواب صاحب تعلیم نسواں کے زبردست حامیوں میں تھے خود ان کی بیگم صاحبہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور جب نواب صاحب کو موقع ملتا تھا وہ اشاعت تعلیم نسواں کی کوشش کرتے۔ کانفرنس میں اگرچہ ۱۸۹۹ء میں اس صیغہ کا اضافہ ہو گیا تھا لیکن عملاً کوئی کام نہیں ہوا۔ ۱۹۰۲ و ۱۹۰۳ء کی کانفرنس منعقدۂ دہلی میں پھر اس صیغہ کی طرف توجہ کی گئی اور شیخ عبداللہ صاحب بی۔ اے ایل ایل بی کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا اور ایک زنانہ اسکول بھی علی گڑھ میں قائم ہوا اور نواب صاحب کے توجہ دلانے سے علیا حضرت سرکار عالیہ دام اقبالہا فرمانروائے بھوپال نے بارہ سو روپے ماہوار کی گرانٹ عطا فرمائی اور ۵ ہزار روپے ترتیب نصاب تعلیم

نسواں کے لئے مرحمت کئے۔ لکھنؤ اور بمبئی وغیرہ میں کانفرنس کے ساتھ زنانہ دستکاریوں کی نمائشیں ہوئیں اور پہلی مرتبہ بمبئی کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۴ء میں پس چلمن خواتین کو کانفرنس کے مباحث اور تقریروں کے سننے کا موقع دیا گیا اس کے علاوہ نواب صاحب نے ۱۹۰۵ء میں جب کہ وہ بمبئی میں مقیم تھے انجمن اسلام کے ایک بڑے جلسہ میں جو زیر صدارت مسٹر جسٹس بدرالدین طیب جی (مرحوم) منعقد ہوا تھا اور جس میں نہایت ممتاز خواتین بھی شریک تھیں ایک پُر زور تقریر کی اور اثناء تقریر میں اس امر پر زور دیا کہ "ملک کی بہبودی بالکل تعلیم نسواں پر منحصر ہے"۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے اپیل کی کہ "علی گڑھ میں مدرسۃ المعلّمات (نارمل اسکول) کی جو تجویز در پیش ہے اس میں اہل بمبئی مدد دیں۔

اگرچہ نواب صاحب کو پورا وقت زنانہ تعلیم کی اشاعت کی کوششوں کا نہیں ملا۔ تاہم انہوں نے کانفرنس میں زنانہ تعلیم کا صیغہ قائم کرکے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک جوش اور سرگرمی پیدا کردی۔ تعلیم نسواں کے متعلق ان کے خیالات نہایت فیاضانہ تھے اور اسے نہایت ضروری سمجھتے تھے لیکن ان کو عمل میں لانے کا موقع نہیں ملا اور یہ کام آئندہ نسلوں پر چھوڑا۔

یونیورسٹی کمیشن میں شہادت یوں تو نواب صاحب نے مختلف کمیشنوں میں شہادتیں ادا کی ہیں لیکن افسوس ہے کہ وہ کاغذات باوجود تلاش دستیاب نہ ہوسکے البتہ ۱۹۰۱ء کے یونیورسٹیز کمیشن کے روبرو جو تحریری شہادت ادا کی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس شہادت میں انہوں نے یونیورسٹی کی تعلیم کے متعلق پبلک کو جو شکایتیں ہیں اُن کو بیان کرکے کہا کہ:۔

> "ان میں بجائے اس کے کہ ایسی تعلیم دی جائے کہ عقل و ذہن کو ترقی ہو، اخلاق و کیرکٹر درست ہو، دماغی اور جسمانی قوتوں کو نشوونما ہو، طوطے کی طرح باتیں یاد کرا دینے پر زور دیا جاتا ہے اور بجائے قوتِ مدرکہ کے قوتِ حافظہ کی پرورش کی جاتی ہے مگر اس قسم کی ناقص تعلیم کا الزام حقیقت میں یونیورسٹی پر ہے نہ کالجوں پر۔

پھر اپنی تائید میں مرحوم سر سید کی رائے یونیورسٹی کی تعلیم کے متعلق بیان کی اور کثرت مضامین

امتحانات کی سختی و بے قاعدگی، نتائجِ امتحانات میں اوسط کامیابی کی خرابی، ایک مضمون میں فیل ہونے کے باعث سب مضامین میں دوبارہ امتحان لینے کے قاعدہ کی سختی، زبان ثانوی کی غیر مفید تعلیم پر بحث کر کے تربیت اور اخلاقی و مذہبی تعلیم کے نہ ہونے کی خرابیوں کو ظاہر کیا ہے اور ایسی تعلیم کے متعلق گورنمنٹ کی مشکلات کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ چند اصول کی پابندی کے ساتھ گورنمنٹ ہر قوم کو ایسی تعلیم کے لئے مدد دے سکتی ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے بورڈنگ ہاؤس کی ضرورت و مشکلات دکھا کر ان امور کو بیان کیا ہے جس سے بورڈنگ ہاؤس کے فوائد حاصل ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں علاوہ نگرانی واخراجات کے جسمانی ورزشوں کے انتظام اور خاص کلب اور خاص سوسائیٹیوں کے قیام پر بہت زور دیا ہے اور علی گڑھ کالج کے بورڈنگ ہاؤس کو مثال میں پیش کر کے تبلایا ہے کہ:-

"جو نمایاں فرق اس کالج کے اور دوسرے کالج کے طلبا میں ہے صرف نتیجہ بورڈنگ ہاؤس کے عمدہ انتظام اور عمدہ صحبت اور پروفیسروں اور طلباء کے باہمی میل جول کا ہے۔"

پھر اس خیال کو کہ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی یونیورسٹی کے متعلق کر دی جائے مضر اور بدگمانی کا سبب قرار دیا ہے۔

آخر میں مذہبی تعلیم پر ایک مبسوط اور وسیع بحث کر کے محمڈن یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت دکھائی ہے اور صاف طور سے کہا ہے کہ:-

"اب میں صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ موجودہ یونیورسٹیاں ہم مسلمانوں کی مختص الحالات حاجتوں کے پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں نہ کسی قسم کی اصلاح سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ تمام حاجتوں کے لئے کبھی کافی ہوں اس مسئلہ پر ۳۰ برس سے غور ہو رہا ہے اور مرحوم سر سید احمد خاں اور ان کے ہم خیال اس امر میں متفق الرائے ہیں کہ ہماری ضرورتیں اسی وقت پوری ہوں گی جبکہ ہم تعلیم و تربیت میں گورنمنٹ کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں سے آزاد ہوں اور اپنی ضرورت اور اپنی مرضی کے موافق اپنی قومی تعلیم کا خود انتظام کریں۔"

مہمانانِ کالج

سرسید کے زمانہ کی روایات کے مطابق نواب صاحب کے زمانہ میں بھی لارڈ کرزن اور نواب صاحبان رامپور مالیر کوٹلہ اور مہاراجہ اندور کالج میں تشریف لائے لیکن ۱۹۰۴ء میں سر جیمس لاٹوش اور ۱۹۰۶ء میں ہز رائل ہائینس پرنس و پرنسز آف ویلز اور ۱۹۰۷ء میں ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان کی تشریف آوری وہ تاریخی واقعات ہیں جو کسی قدر تفصیل کے ساتھ قابل الذکر ہیں۔

۱۔ ہز آنر سر جیمس لاٹوش کی تشریف آوری

۱۹۰۴ء میں ہز آنر سر جیمس لاٹوش کی تشریف آوری کالج کا ایک قابل یادگار واقعہ ہے یوں تو ہز آنر اس سے قبل بھی تین دفعہ کالج میں تشریف لائے لیکن وہ تشریف آوری خطرات و ترددات کی تاریکیوں میں تھی اور جس کے دور کرنے پر ان کی توجہ مبذول رہتی تھی مگر اس مرتبہ وہ ایسے زمانہ میں تشریف فرما ہوئے جبکہ انہوں نے اپنی حوصلہ افزائیوں اور ہمدردیوں کے شاندار نتائج بھی ملاحظہ کئے۔

اس موقع پر کالج کی آراستگی ایسے ایسے اعلیٰ پیمانہ پر کی گئی تھی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی ٹرسٹیوں اور دیگر معزز مہمانوں کا بھی غیر معمولی مجمع تھا اسی موقع پر نظام میوزیم[۱] اور آسمان منزل[۲] کا افتتاح ہز آنر کے مبارک ہاتھوں سے کرایا گیا۔

عربی تعلیم کی اسکیم کا مسئلہ زیر بحث تھا وہ ٹرسٹیوں اور ہز آنر کی پرائیوٹ گفتگو سے طے ہوا ان بعد ایڈریس پیش کیا گیا اور ہز آنر نے اس مسئلہ کے متعلق اپنی زبانی تقریر میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اس کے بعد عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے چندوں اور وظیفوں کا اعلان ہوا ۲۵ ہزار روپیہ یک مشت کمروں کی تعمیر اور وظیفوں کے لئے اور ۳ ہزار روپیہ سالانہ کے مستقل وظائف کا اعلان ہوا جس وقت چندوں اور وظائف کے اعلانوں کی گرم بازاری تھی اس وقت اسٹریچی ہال چیرز سے گونج رہا تھا اور ہز آنر اس قدر مسرور و شادماں تھے کہ انہوں نے خود بھی کئی بار ان اعلانات پر

---

[۱] اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سادس کے نام سے منسوب ہے۔

[۲] امیر اکبر سر آسمان جاہ کے عطیہ سے تعمیر ہوا۔

چیرز دیئے۔

۲- دیر رائل ہائینسز پرنس و پرنسز آف ویلز کی رونق افروزی

مسلمانان ہندوستان کے لئے ۸ر مارچ ۱۹۰۶ء کا یوم سعید اپنے عظیم الشان قابل افتخار اور راعی و رعایا کے جذبات کی نمائش و اظہار کے اعتبار سے ایک تاریخی واقعہ رہے گا۔

یہ وہ مبارک تاریخ تھی جس میں موجودہ ملک معظم قیصر ہند نے بہ حیثیت پرنس آف ویلز و ولیعہد سلطنت برطانیہ مع پرنسز آف ویلز (موجودہ ملکۂ معظمہ) مسلمانوں کے دار العلوم کو اپنی رونق افروزی سے سرفراز فرمایا شاہی راستہ کی آرائش اور کالج کی آراستگی و زیبائش میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا گیا تھا دور دور سے ٹرسٹیان اور بہی خواہان کالج طلبائے قدیم اور رؤسا و امرا اس تقریب سعید میں شرکت کے لئے آئے ہز ہائی نس آغا خاں جو اس تقریب سعید کے بانی اور روحِ رواں تھے ۳ دن پہلے آگئے تھے ہز آنر سر جیمس لاٹوش حکومتِ صوبہ اور کالج دونوں کے تعلق سے موجود تھے ایک بجے دن کو شاہی مہمان اسٹیشن سے کالج میں رونق افروز ہوئے وکٹوریہ گیٹ پر عہدہ داران کالج کا رسمی تعارف ہونے کے بعد دیر رائل ہائی نسز نے مہمانوں اور ٹرسٹیوں کے ساتھ لٹن لائبریری میں لنچ تناول فرمایا۔ لنچ سے فارغ ہونے کے بعد اسٹریچی ہال، کالج کلاسز، پختہ بارگ، انگلش وارڈ، اسکول، مسجد، وغیرہ کا ملاحظہ کیا پختہ بارگ کے چھ کمروں کے طلباء کو بھی اپنے شاہانہ الطاف سے شرفِ تکلم عطا فرمایا اس معائنہ کے بعد مراجعت فرمائی اور اس طرح یہ مبارک تقریب جس میں شاہانہ عظمت و جلال کی شان نمایاں تھی ختم ہوئی۔

اس موقع پر ہز رائل ہائینس کی منظوری سے ایک سائنس اسکول حضور ممدوح کے نام نامی سے موسوم ہو کر قائم ہوا اور اس اسکول کے لئے بمبئی کے مشہور فیاض تاجر سر آدم جی پیر بھائی نے ایک لاکھ دس ہزار روپیہ اور ہز ہائی نس آغا خاں اور راجہ صاحب محمود آباد نے پینتیس پینتیس ہزار اور دیگر معطیان نے چونسٹھ ہزار چھ سو گیارہ روپے مرحمت کئے اور ۲ ہزار سالانہ کی مستقل امدادیں ملیں۔

۳۔ اعلیٰ حضرت ہز مجسٹی امیر افغانستان کا ورود | ہنوز یہ رابرچ کا نظارہ تازہ تھا کہ یہ مژدۂ فرحت فزا سامعہ نواز ہوا کہ سراج الملۃ والدین اعلیٰ حضرت ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں والیٔ دولت خداداد افغانستان بتاریخ ۱۶ جنوری ۱۹۰۷ء اپنے قومی کالج کو قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیں گے۔

اس مژدہ نے قلوب میں ایک خاص لہر پیدا کر دی ایک ہمسایہ مسلمان بادشاہ کا اپنے قومی کالج میں تشریف لانا ایک غیر معمولی جوش و مسرت کا موقع تھا ہر مسلمان کی خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس نظارہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے چنانچہ مدراس، دکن، بنگال، بمبئی، پنجاب، سندھ وغیرہ غرض کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں سے سراج الملت والدین کی زیارت کو مسلمان نہ آئے ہوں حتیٰ کہ بعض علماء و مشائخ بھی جن کو اس وقت تک کالج سے تنفر تھا اس موقع پر شریک ہوئے اور اتنی کثیر تعداد مہمانوں کی جمع ہوئی کہ کالج کے وسیع کمپونڈ اور عمارتوں کے علاوہ شہر میں ان کے قیام کا انتظام کرنا پڑا۔

کالج کے در و دیوار کی آرائش و زیبائش میں ہر ممکن اہتمام کیا گیا تھا جو منتظمین کے سلیقہ کا حیرت انگیز نمونہ تھا۔

۱۰ بجکر ۴ منٹ پر ہز مجسٹی کا اسپشل علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچا عہدہ داران کالج کے رسمی تعارف کے بعد اسٹیشن سے شاہانہ عظمت و شان کے ساتھ شاہی سواری احاطہ کالج میں داخل ہوئی ٹرسٹیان و عہدہ داران کالج نے صدر دروازہ پر استقبال کیا اور معرفی کی رسم ادا ہوئی مسیح الملک (سابق حاذق الملک) حکیم اجمل خاں اور مولانا حالی (مرحوم) کا خاص طور پر تعارف ہوا انٹروڈکشن کا سلسلہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ہز مجسٹی کا وہ مکالمہ شروع ہوا جس نے فوراً منکشف کر دیا کہ شاہ افغانستان محض تماشا دیکھنے اور تماشا دکھانے کے لئے نہیں آئے بلکہ ان کی غرض کالج کے متعلق اصل حالات کی تحقیقات اور عین الیقین حاصل کرنا ہے۔ ہز مجسٹی کی تشریف آوری ایک بھولے بھالے مشرقی حکمراں کے آنے سے جو ظاہری صورت اور تکلفات سے خوش و مطمئن ہو جاتا ہے یا ایک یورپین وزیٹر کی آمد سے جو مغربی طرز تعلیم اور طریقوں سے قدرتاً مانوس اور ان کا قدردان ہوتا ہی بالکل

مختلف تھی۔ علاوہ ازیں کالج کی مختلف باتوں سے ہز مجسٹی کے اس قدر کان بھرے جاچکے تھے کہ کالج کے مسلّمہ اصول و فوائد کا ذہن نشیں کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا چنانچہ ہز مجسٹی نے اثنائے انٹرو ڈکشن ہی میں فرمایا کہ :۔

"میں نے اس کالج کے متعلق بہت سی باتیں سنی ہیں بعض اس کے موافق ہیں اور بعض مخالف لیکن مخالف باتیں زیادہ سنی ہیں مگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ سچ اور جھوٹ میں ۴۔ انگل کا فاصلہ ہے جو آنکھ اور کان کے درمیان ہے۔ کان سے میں نے سن لیا اب آنکھ سے دیکھنے آیا ہوں۔"

نواب محسن الملک نے اس کے جواب میں کالج کے فوائد کا اظہار کرنا چاہا لیکن ہز مجسٹی نے فرمایا کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ "مجھ سے اس کالج کی بہت برائیاں بیان کی گئی ہیں"۔ نواب محسن الملک نے اس کے جواب میں یہ قطعہ پڑھا:

قطعہ

قِیلَ اِنَّ الرَّسُولَ قَد کَہِنَا   قِیلَ اِنَّ الالٰہ ذُو ولد[1]

من لسان الوریٰ فکیف انا   ما نجی اللہ والرسول معاً

اس پر ہز مجسٹی نے فرمایا :۔

"سچ ہے لیکن جب تک کہ ہر چیز کا معائنہ اور ہر شخص کا امتحان خود نہ کر لوں، کالج کے متعلق میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتا اس کے بعد جو میری رائے ہوگی اس کا اظہار کر دوں گا مگر شاید میری رائے تمہیں پسند نہ آئے۔"

نواب محسن الملک نے برجستہ جواب دیا کہ :۔

"شب کی تاریکی کے بعد آفتاب کی روشنی کون پسند نہ کرے گا۔"

---

[1] یعنی لوگوں نے خدا پر بھی بہتان اٹھائے ہیں کہ وہ صاحب اولاد ہے حضرت رسالت پناہ صلعم کو بھی نعوذ باللہ جادوگر کہا ہے جبکہ خدا اور رسول بدگویوں کی زبان سے نہ بچے تو ہم کس گنتی شمار میں ہیں۔

ہز مجسٹی نے فرمایا "الّاخفاش" نواب محسن الملک نے عرض کیا ؎

گر نہ بیند بروز شپرّہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اس کے بعد ہز مجسٹی مسقّف راستہ سے طلبا اور مہمانوں کا سلام و آداب لیتے ہوئے اور جواب میں وعلیکم السلام کہتے ہوئے بنگ منزل میں رونق افروز ہوئے۔

چند گھنٹہ آرام فرمانے کے بعد بنگ منزل میں اعلیٰ حضرت نے نواب محسن الملک کو اپنے پاس طلب کیا اور تقریباً پون گھنٹے تک کالج کے متعلق مختلف حالات دریافت فرماتے رہے۔ کالج کی گزشتہ تاریخ، اس کے مقاصد واغراض، معاونین کے نام، ان کے عطیوں کی تعداد، کالج کا طریقہ تعلیم اور علی الخصوص تعلیم دینیات کے متعلق بہت سے دقیق سوالات کئے اور نواب محسن الملک ہر سوال کا برجستہ اور خاطر خواہ جواب عرض کرتے رہے سائنس اسکول کی ضرورت ہز رائل ہائینس کے اسم گرامی سے منسوب کر کے معطیان کے فیاضانہ عطیات اور گورنمنٹ کی امداد کا بھی تذکرہ کیا ہز مجسٹی نے اس تمام کیفیت کو بہت توجہ اور دلچسپی سے سنا اور عربی تعلیم کے متعلق استفسار فرمایا کہ:۔

"کس قسم کی تعلیم دیجائے گی" نواب محسن الملک بہادر نے عرض کیا کہ گریجویٹ عربی علوم و فنون وادب وفلسفہ میں حاصل کیا کریں گے اور عربی علم وادب اور تاریخ کے خزانوں کی تحقیقات میں مصروف ہوں گے۔

ہز مجسٹی نے اس پر فرمایا کہ "عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے پڑھنے والے کہاں ملیں گے اور اس کی خواہش کس کو ہے اور اس سے دنیاوی معاش میں کیا مدد مل سکتی ہے"۔ نواب محسن الملک نے عرض کیا کہ یہ سچ ہے اور اسی خیال سے پڑھنے والوں کی ترغیب کے لئے ؎۔ روپیہ ماہوار وظیفہ ہر طالب علم کو دیا جائے گا اور اس کے لئے اکثر فیّاض اور نیک دل مسلمانوں نے امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے اور چندہ دیا ہے۔ اس پر امیر صاحب نے فرمایا کہ "ایسی تعلیم تو صرف چند خاص

طالبعلم شاید حاصل کر سکیں گے عام درسگاہوں اور انگریزی خوانوں کے لئے تو ضرورت اس
بات کی ہی کہ ان کو دینیات کی اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ اسلامی اصول اور اسلامی عقائد
اور اسلامی احکام سے جو متعلق عبادت کے ہوں واقف ہوں اور اسلام کی حقیت اور اس
کی سچائی کا ان کو یقین ہو تاکہ وہ مسلمان رہیں اور مسلمانی مذہب پر ثابت قدم رہ سکیں۔ نواب
محسن الملک نے گزارش کیا کہ اس کا انتظام یہاں پہلے ہی سے موجود ہے اور اس پر عمل
ہوتا ہی ہز مجسٹی نے فرمایا کہ "جب تک میں بذاتِ خود امتحان نہ کرلوں اور بچشم خود ہر ایک چیز کو
تحقیق نہ کرلوں کوئی رائے ظاہر نہیں کرسکتا" اعلیٰ حضرت نے نواب محسن الملک سے کہا کہ میں
دو حیثیت سے کالج دیکھ سکتا ہوں ایک بطور ممتحن کے دوسرے بطور سیاح کے پہلی حیثیت سے ضرور
ہی کہ ہر بات کی تحقیق و تفتیش اور طلبا کا امتحان کر کے میں اپنی خالص رائے ظاہر کروں دوسری
حیثیت سے ایک سیاح کی طرح معمولی اور رسمی طور سے کالج کو دیکھ کر رخصت ہو جاؤں تم ان دونوں
باتوں میں سے کس کو ترجیح دیتے ہو مگر چونکہ تمہیں خوف ہوگا کہ نہ معلوم میں کیا رائے ظاہر کروں
اس لئے شاید تم یہ زیادہ پسند کروگے کہ میں خاموشی کے ساتھ کالج کی سیر کر کے واپس چلا
جاؤں۔ اعلیٰ حضرت نے بار بار زور دیا کہ میری اچھی یا بری رائے جو کچھ ہوگی وہ پورے امتحان
لینے کے اوپر منحصر ہوگی اور وہی میں صاف صاف ظاہر کروں گا بلکہ اپنی رائے تمہیں لکھکر دے
جاؤں گا تاکہ اس میں کسی غلط فہمی اور شبہ کی گنجائش نہ ہو سکے"۔

یہ سوال بہت بڑا اور اہم تھا اور ہر شخص محسوس کرے گا کہ اس وقت کالج کی آئندہ قسمت
شاہ افغانستان کی رائے پر منحصر ہو گئی تھی سراج الملۃ والدین کا اس کالج کی نسبت بری رائے
ظاہر کرنا اولڈ فیشن اسلامی دنیائے ہندوستان کو جو ابھی پورے متوجہ بھی نہیں ہوئے کالج
کی طرف سے نہ صرف پورے طور پر بدظن کرنے کے لئے کافی تھا بلکہ اس کے حق میں موت کا حکم
اگر نہیں تو تقوہ کا اثر ضرور رکھتا تھا مگر "وہ تو پاک باش برادر مدار از کس باک"۔
ہز مجسٹی کے اہم سوال کا نواب محسن الملک نے جواب دیا کہ تمام ٹرسٹیان کالج نہایت خوشی

سے اس بات کو پسند کریں گے کہ اعلیٰ حضرت بہ حیثیت شاہ افغانستان اور مذہبی عالم ہونے کے پورا امتحان لیں اگر حضور نے کالج کو قابل اطمینان پایا تو جو رائے حضور ظاہر فرمائیں گے کالج کے لئے نہایت مفید اور ایک بے بہا سند ہوگی اور تمام ہندوستان میں پھر کوئی اس کالج کی تعلیم دینیات پر غلط الزام لگانے اور اس کے بدنام کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا اور اگر اعلیٰ حضرت کی نظر میں نقص معلوم ہوئے تو ان کا اظہار بھی آئندہ ان نقائص کے دور کرنے کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا اس لئے ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت اچھی طرح دینیات کی تعلیم کا امتحان لیں اور اس کے بعد جو رائے قائم ہوئے سے صاف صاف جیسا کہ اعلیٰ حضرت کا منشا ہی ظاہر فرما دیں۔

اس کے بعد نواب محسن الملک نے عرض کیا کہ بہت سے لوگوں نے قصائد لکھے ہیں آیا اعلیحضرت ان کے قصائد پڑھے جانے کی اجازت دیں گے؟ اس کے جواب میں ہز مجسٹی نے فرمایا کہ افغانستان میں ایک شاعر میرے سنانے کے لئے ایک قصیدہ لکھ کر لایا جس میں حاتم کی سی سخاوت اور رستم کی سی شجاعت اور نوشیرواں کی سی عدالت میری طرف منسوب کی گئی تھی۔ قصیدہ بہت طویل تھا میں نے دو ایک ہی شعر پڑھ کر واپس دیدیا اور اپنے مداح شاعر سے کہا کہ یہ قصیدہ میری شان میں تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اس میں جو اوصاف ممدوح کے لکھے گئے ہیں وہ میں اپنے میں نہیں پاتا یہ صفتیں جس میں موجود ہوں اس کو تلاش کر کے اپنا قصیدہ سناؤ، تمہارا ممدوح میں نہیں ہوں جس کی شان میں یہ قصیدہ کہا گیا ہے وہ دوسرا کوئی ہوگا۔ اس حکایت سے تم کو معلوم ہوگا کہ میں قصائد نا پسند کرتا ہوں اور اس لئے معافی چاہتا ہوں۔

یہ جواب سنکر حاضرین کے دل پر اعلیٰ حضرت کی منکسر المزاجی اور راست پسندی کا جو اثر ہوا ہی مدۃ العمر نہ بھولے گا۔

رخصت ہونے سے پیشتر نواب محسن الملک نے عرض کیا کہ گزشتہ تشریف آوری کے موقع پر حضور شہزادہ ولیعہد و ولیعہد بیگم نے کالج کے ٹرسٹیوں کے ساتھ لنچ تناول کیا تھا امید ہے کہ اعلیٰ حضرت بھی یہ افتخار ٹرسٹیوں کے لئے منظور فرمائیں گے۔

ہز مجسٹی نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ بالفعل میں اس درخواست کو قبول نہیں کرسکتا میں کوئی بات ایسی نہ کرونگا جس کے معنی یہ لئے جا سکیں کہ میں نے کالج کو اور اس کے طریقۂ تعلیم اور اس کے متولیوں کی کارروائی کو پسند کیا تا وقتیکہ میں بخوبی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال نہ کرلوں اگر میری تحقیق میں کالج پسند کے قابل ثابت ہوا تو میں خوشی سے تمہارے ساتھ شریک طعام ہوں گا اس سے پیشتر نہیں۔ یہ سادہ اور صاف جواب سنکر نواب محسن الملک حیرت زدہ رخصت ہوئے۔

لنچ سے فارغ ہوکر اعلیٰ حضرت نے پختہ بارگ کا ملاحظہ فرمایا ڈائننگ ہال سے سر ہنری میکموہن[1] اور نواب محسن الملک کو اپنی گاڑی پر بٹھایا اور مختلف بورڈنگ ہاؤسوں کا معائنہ فرماتے ہوئے انگلش ہوس تشریف لے گئے راستہ میں نواب صاحب نے ہر عمارت اور اس کے بانیوں اور معطیوں کی مختصر کیفیت گوش گزار کی۔

بعد ظہر مسجد کالج میں مہمانوں اور طلبا کی جماعۃ کے ساتھ نماز ادا کی اور خود امامت فرمائی زاں بعد نظام میوزیم میں طریقۂ تعلیم معائنہ کیا۔

پھر بغیر کسی ماقبل اطلاع کے شیعہ سنّی طلبا کا امتحان دینیات لیا جس میں بعض سوال بالکل معمہ کے طور پر تھے طلبا نے نہایت تیزی سے صحیح صحیح جوابات دئیے آخر میں ایک طالبعلم علی الدین سے قرآن مجید کی ایک سورت سنی۔

کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ یہ جزو ضعیف شیر افغانستان کو زار قطار رولا کر اُٹھے گا اس نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ اعوذ و بسم اللہ کے بعد صاف آواز اور خالص مصری مگر شیریں تراز نبات لہجہ اور قرأت میں انّ فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنہار لاٰیٰت لاولی الالباب الخ سورہ آل عمران کا یہ رکوع سنانا شروع کیا دو چار ہی آیتوں نے نظام میوزیم میں ایک سماں باندھ دیا اس کی آواز، عمدہ قرأت، مصری لہجہ، اور ان آیات کے بلیغ معانی اور کلام پاک کی فصاحت اور موقع کی عظمت ان تمام باتوں کے مجموعی اثر نے حاضرین کو محو اور

---

[1] برطانوی عہدہ دار جو اعلیٰ حضرت کے ساتھ تھے۔

ان پر وجد کی کیفیت طاری کر دی جو کھڑے تھے وہ نقش بدیوار تھے اور جو کرسیوں پر بیٹھے تھے وہ بُت بنے ہوئے تھے سب سے زیادہ متاثر ہوا جو اس مجمع میں سب سے بلند مرتبہ اور قوی شوکت تھا یعنی خود اعلیٰ حضرت ہز مجسٹی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور رخساروں سے ڈاڑھی تک مسلسل چلے آتے تھے، جب تک یہ رکوع ختم ہو دو رومال اشکوں سے تر ہو چکے تھے رکوع کا ختم ہونا ایک مقدس نغمہ کا تھمنا تھا۔ تمام حاضرین نے ایک روحانی سناٹا محسوس کیا اور سب سے پہلے ہز مجسٹی کی آواز سنائی دی الحمد للہ کہکر اعلیٰ حضرت کرسی سے کھڑے ہو گئے اور نہایت زور اور جوش کے ساتھ بار بار زبان مبارک سے کبھی اردو میں فرماتے تھے کہ جو کچھ بدگوئی اس کالج کی لوگوں نے مجھ سے کی سب غلط سب غلط سب جھوٹ ہی کبھی انگریزی میں سر ہنری میکمن کی طرف دیکھکر شد و مد سے ارشاد کرتے تھے اور کبھی فارسی میں زور دیکر کہتے تھے کہ

"ہمہ دروغ است وکذب وبدگوئی"

نواب محسن الملک کی اس سخت پُرخطر آزمائش سے ایسی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی خوشی اور مسرت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس وقت موجود تھا اور نتیجہ دیکھنے کے لیے بےچین اور بے قرار تھا آخر ہز مجسٹی نے فرمایا کہ جو کچھ مجھ کو اپنا خیال ظاہر کرنا ہے میں بیان کرتا ہوں "جس شخص کو اپنے دین سے پختہ خبر ہو اس کو کیوں اجازت نہ ہو کہ علوم معاش حاصل کرے ؟ دین کی واقفیت کے متعلق ہم نے طلبا کا امتحان کر لیا اور تشفی کر لی ہمارا جواب ہی کہ "سب اچھا اور ہم بہت خوش" کچھ اور فرمانے والے تھے کہ نواب محسن الملک نے عرض کیا کہ "اعلیٰ حضرت کے انتظار میں صدہا مسلمان جو ہندوستان کے مختلف حصص سے شوقِ زیارت میں آئے ہیں اور اسٹریچی ہال میں جمع ہیں۔ اعلیٰ حضرت وہیں قدم رنجہ فرمائیں اور ان کے سامنے ان خیالات کا اظہار ہو تو عین نوازش ہی اعلیٰ حضرت نے فوراً منظور فرمایا اور اسٹریچی ہال میں تشریف لائے۔

یہاں پہلے ایڈریس پیش کیا گیا۔ جب ایڈریس میں تعلیم دینیات کا ذکر شروع ہوا تو اعلیٰ حضرت نے روک دیا اور فرمایا کہ "اس کے پڑھنے کی اب ضرورت نہیں ہے میں خود دینیات کا امتحان

ابھی لے چکا ہوں اور مجھے اس کی پوری حالت معلوم ہو گئی ہے۔ ع

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

اس کے بعد کرسی سے کھڑے ہو کر نطق شاہانہ فرمایا:-

"اکثر مردم درباب ایں کالج قسم قسم سخنہا می گفتند لاکن ما آمدیم برائے علم آوری وما شکر گزاریم از گورنمنٹ انڈیا کہ اوما اجازت داد ایں راکہ دریں کالج کہ اکثر مردم اسلام کہ دریں جا آمدہ اند بہ بینیم حالا آمدم بر سر مطلب۔ امروز کہ ما آریم بقسم بسیار درست۔ وانچہ معلوم بود از اصول دین، ما سوال کردیم از شاگرداں کہ دریں کالج بودند و شکر می کنیم! و باز شکر می کنیم کہ ایں شاگرداں در عقائد اسلام خود کامل و مکمل اند۔ اول کسے کہ دہن بد گویاں بزبان بند کند او "من" خواہم بود۔ ما گاہے نخواہم گفت کہ کسے از علوم یورپ نخواند نخواند و نخواند! لاکن بعد تکمیل مسلمانی چنانچہ خود ما، در افغانستان یک کالج حبیبیہ بنا کردہ ایم۔ در وہم جاری کردیم علم مغرب زمین لاکن بعد ازیں کہ شاگرداں "پورا" مسلمان شوند۔ وایں شاگرداں کہ امتحان کردیم ہمہ در اصول دین درست و کامل اند حالا می خواہیم کہ عملاً امداد ایں کالج بکنیم لاکن ما افسوس می کنیم کہ ما امداد کالج مکمل دریں جا کردن نمی توانیم، چونکہ در دولت خود از برائے ایں کار محتاجیم سرازیں وبا ایں ہم ما برائے ہمیشہ ہمیشہ ماہے پنج صد روپیہ می دہیم و نصیحت ما خواہد بود کہ طلبا مسلمان اول ہمیں قدر کہ امروز امتحان گرفتیم تعلیم دینی دادہ شود بعد ہر طرف رو گردانند و حالا یک مشت ایک دم کہ ایں سالانہ نیست بست ہزار روپیہ می دہیم سلام۔

(دیگر) حضرات کہ دریں جا حاضر ہستند ہمہ را باماں خدا می سپاریم و وداع می کنیم و حالا بجائے خود می رویم و امشب با حضرات ایں کالج (ٹرسٹیاں) کہ بست و پنج کس می باشند باہم نان می خوریم و می رویم سلام"۔

اعلیٰ حضرت کے اعزاز میں ایک گارڈن پارٹی بھی ہوئی جس میں بوجہ تکان شریک ہونے کی معذرت کی شب کو روشنی کا خاص اہتمام تھا اور کالج دن عید رات شب برات کا مصداق بن گیا

تھا بعد مغرب اعلیٰ حضرت نے نواب صاحب اور چند دیگر ٹرسٹیاں کو طلب فرما کر بیس ہزار عطیہ یک مشت اور چھ ہزار عطیہ دوامی سالانہ ایک سال کا پیشگی عطا فرمایا اور اپنے دستِ مبارک سے ایک تحریری سند عطا کی ازاں بعد لٹن لائبریری میں ۲۴ ٹرسٹیوں کے ساتھ کھانا تناول فرمایا جس کا انتظام خود اعلیٰ حضرت کی طرف سے تھا نماز عشا سے فارغ ہو کر پھر نواب محسن الملک نواب ممتاز الدولہ سر فیاض علی خاں پریسیڈنٹ ٹرسٹیاں (مرحوم) اور مولانا حالی (مرحوم) کو یاد فرمایا اور مولانا کا قصیدہ جو اس تقریب کے لئے انہوں نے تصنیف کیا تھا ان کی زبان سے سنا۔

اس کے تھوڑی دیر کے بعد اعلیحضرت نے الوداع کہکر مراجعت فرمائی اس موقع پر یادگار تشریف آوری اعلیٰ حضرت مسلمان معطیوں کی طرف سے تقریباً ۲۰ ہزار روپیہ کے اعلانات بھی ہوئے

درحقیقت نواب محسن الملک کے لئے یہ بڑا نازک موقع تھا اور جہاں تک ان کی زندگی کا تعلق ہے وہ کبھی ایسے خطرناک امتحان میں مبتلا نہیں ہوئے لیکن تائید ایزدی سے وہ کامیاب ہوئے اور بقول[1] مولانا حالی (مرحوم) محسن الملک نے اس موقع پر غیر معمولی لیاقت ظاہر کی اور خدا کا شکر ہے کہ ان کی سعی مشکور ہوئی اور امید اور توقع سے بڑھکر بالکل غیر متوقع کامیابی ان کو حاصل ہوئی۔

سعی و عمل اور اُس کے نتائج کا خلاصہ جس وقت اور جن حالات میں نواب صاحب نے سرسید کی قائم مقامی اور قومی تعلیم میں مساعی اور جدوجہد کا بار اپنے شانوں پر قبول کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۶۲ سال کی تھی اور حیدرآباد کی پُرمشقت ملازمت کے بعد آرام لینے کا زمانہ تھا۔ ساتھ ہی صحت خراب تھی اور ہمیشہ امراض کا حملہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن انہوں نے کالج اور قوم کی خاطر نہایت بلند حوصلگی سے کام شروع کر دیا ان کا پہلا کام یہ تھا کہ یونیورسٹی کا تخیل ہر مسلمان کے دماغ میں پیدا کر دیا اور مختلف صوبہ جات میں کانفرنس کے جو اجلاس منعقد ہوئے ان میں یہی مسئلہ معرکۃ الآرا رہا اس کے علاوہ اودھ، جوناگڈھ، بھوپال، رنگون، برما، پٹنہ، ڈھاکہ، صوبہ مشرقی بنگال، و آسام کا دورہ کیا۔ لیکچروں اور پرائیوٹ ملاقاتوں میں مسلمانوں کی قومی تعلیم، کالج کی ترقی، اور یونیورسٹی کے قیام، پر رؤسا اور تجار اور عام مسلمانوں کو توجہ دلائی

[1] مکتوبات حالی صفحہ ۳۰۰

ان کوششوں کے اندازہ کے لئے اس موقع پر رنگون کا واقعہ خود نواب صاحب ہی کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

انہوں نے ۱۹۰۵ء کے اجلاس کانفرنس میں ایک رزولیوشن پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"جب میں پچھلے سال رنگون گیا۔ مولوی بشیر الدین صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔ یہ تو ار احمد جو یہاں بیٹھے ہیں انہوں نے جاکر میری تعریفیں کیں کہ امام زماں ہیں مہدی ان کا نام ہو وہ قوم کے بہت بڑے خیر خواہ ہیں اسی سے اُن کا نام "محسن الملک" ہے۔ ہمارے سیٹھ عبد الکریم سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے فوراً طلبی کا تار بھیجدیا وہ بیچارے یہ کیا جانتے تھے کہ یہاں بوریا بستر باندھے تیار بیٹھے ہیں۔ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ میں تو جاتا ہی ہوں مگر ایک مولوی کا ایک نیچری کے ساتھ ہونا بھی ضروری ہے اس لئے جناب مولوی سلیمان صاحب پھلواری کو ساتھ لیا۔ استقبال تو اچھا ہوا۔ بہت سے لوگ محض اس خیال سے آئے کہ دیکھیں انگریزی ٹوپی پہنے ہوئے ہے یا ڈاڑھی منڈوائے ہوئے ہے یا کوئی دُم لگی ہوئی ہے۔ سیٹھ عبد الکریم بیچارے نے ایک عمدہ بنگلہ رہنے کے لئے آراستہ کیا تھا ہمارے پُرانے مہربان حضرات علما نے کہنا شروع کیا کہ دجّال آیا ہے۔ رمضان کا مہینہ ہے خدا کے واسطے اس سے بچنا۔

اصل یہ ہے کہ وہاں دریائے فصاحت بہانے کا موقع نہ تھا بلکہ جیسی چھوٹی چھوٹی نالیاں تھیں ویسے ہی پانی بہا دیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی روز شام ہونے سے پہلے پچاس ساٹھ آدمی ملنے آئے اور دوسرے روز کوشش کی گئی کہ ایک وعظ ہو جائے۔

چونکہ صدق دل سے سخنِ حق کا اثر ضرور ہوتا ہے اس لئے جب انہوں نے تعلیم کے حالات اور اس کے فوائد سنے تو نہایت متاثر ہوئے خصوصاً اس بات کا بڑا اثر ہوا جب اُن سے یہ کہا گیا کہ: ایک وقت ہماری حالت یہ تھی کہ سلطنت کا آفتاب اسی ہندوستان سے طلوع

ہوا تھا اور اس کی شعاعیں رنگون تک پہنچی تھیں مگر وہ آفتاب بالآخر رنگون میں آکر غروب ہو گیا (یعنی بہادر شاہ آخری تاجدار دولتِ مغلیہ کی قبر رنگون میں ہے) صاحبو! اب سلطنت کا لوٹنا تو ممکن نہیں تم اہلِ دولت ہو اب علم کا آفتاب طلوع کر سکتے ہو جو رنگون سے طلوع ہو اور دلّی تک روشنی پھیلائے"۔

اس اسپیچ کا یہ اثر ہوا کہ صرف تین دن میں پینتیس ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔

طلبا کی کثرت نواب صاحب نے اپنے دَوروں میں نہ صرف رؤسا و امراء وغیرہ سے امدادیں اور چندے حاصل کئے بلکہ اپنی اولاد کو کالج میں داخل کرنے کی ترغیب دی چنانچہ سابق راجہ ناگپور، نوابان مرشد آباد، ڈھاکہ، بیگم پلی (مدراس) سورت، منگرول، اور سچین کے خاندانوں کے لڑکوں اور ٹونک کے ولیعہد کا بھی بحیثیت ایک طالبعلم کے داخلہ ہوا۔

اس کے علاوہ دو تین سال کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب اور ممالک شمالی مغربی اور اودھ کے طلبا کے علاوہ برما، کلکتہ، میسور، حیدرآباد، بمبئی، سندھ اور بلوچستان، کے طلبا بھی داخل ہونے لگے اور ہر سال یہ تعداد ترقی پذیر رہی۔

غرض فروری ۱۹۰۷ء میں طلبا کی تعداد ۲۶۰ تھی جس میں ۲۲۷ بورڈر تھے۔[۱]

سائنس اور عربی تعلیم کا انتظام ہز رائل ہائینس پرنس آف ویلز کی رونق افروزی کی یادگار میں سائنس اسکول بھی قائم ہوا جس کی اس تعلیم گاہ میں سخت کمی اور اشد ضرورت تھی مشرقی علوم و فنون کی ترقی کے لئے اعلیٰ پیمانہ پر عربی کی شاخ کا انتظام کیا گیا جس میں ایک ہزار روپیہ ماہانہ گرانٹ کے علاوہ عربی لینے والے طلبا کے لئے متعدد وظائف معیّن ہوئے ایک مشہور مستشرق جرمن عالم ڈاکٹر ہارووِٹز بطور پروفیسر اور ایک عرب عالم اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کئے گئے۔

عماراتِ کالج سرسید مرحوم نے کالج کی عمارتوں کو نہایت شاندار اور وسیع پیمانہ پر شروع کیا تھا ان

---

[۱] مارچ ۱۸۹۰ء کے مقابلہ میں ۵۱۹ طلبا کا اضافہ ہوا یعنی مارچ ۱۹۰۸ء میں کل ۳۴۳ طلبا تھے ۲۲۹ بورڈر ۱۴ ڈِٹے اسکالر۔

کا نفیس و بلند مذاقِ تعمیر ہر عمارت میں نمایاں تھا وہ کالج کو عمارات کے لحاظ سے بھی رفیع الشان بنانا چاہتے تھے اور بلاشبہ عمارتوں کی عظمت و رفعت میں بھی ایک جذبہ و کشش ہوتی ہے اس لئے ان کا خیال تھا کہ جب مسلمان اپنے قومی کالج کو ایسا شاندار دیکھیں گے تو خود بخود اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ وکٹوریہ گیٹ اور اسٹریچی ہال مکمل ہو چکا تھا مگر پختہ بورڈنگ ہاؤس (سر سید کورٹ) ناتمام تھا بعض عمارات کی بنیادیں بھری ہوئی تھیں بعض کا نقشہ ہی مرتب تھا مسجد کا کام شروع ہو گیا تھا لیکن ابتدائی حالت میں تھا۔

نواب صاحب نے کالج کو قرضہ سے سبکدوش کرتے ہی ناتمام اور جدید عمارتوں کی طرف توجہ کی۔

مسجد کی تعمیر کا سلسلہ جاری کیا دونوں طرف کے مینار اور تین گنبد تیار کرائے پختہ بارگ کی غربی جانب کی لائن میں سترہ کمرے تیار ہوئے۔ اسٹریچی ہال کے بازو کے کمرے مکمل ہو گئے۔ نظام میوزیم، آسمان منزل، قدیم عمارات کے سلسلہ میں مکمل ہوئیں۔ کرزن ہاسٹل، ممتاز، لاٹوش بورڈنگ ہاؤس علحدہ تیار ہوئے ڈبنیچ کورٹ کی تکمیل کی گئی چار جدید کمرے تعلیم اسکول کے لئے تعمیر ہوئے احاطہ کی جالیوں کی بہت بڑی قطار پوری ہوئی وکٹوریہ گیٹ کے دروازے پر ایک عمارت کا کام جاری ہوا۔

گورنمنٹ سے بیس ہزار روپیہ ایک بورڈنگ ہاؤس کے لئے حاصل کیا جو بعد کو تیار ہو کر میکڈانل ہاؤس کے نام سے موسوم ہوا اس کے علاوہ کالج کے قریب ۱۱ بیگہ ۲ بسوہ پختہ اراضی حاصل ہوئی اور جنرل پیرن کے مشہور صاحب باغ کے لئے بھی کارروائی کی گئی جو ۱۹۰۰ء میں گورنمنٹ سے عطا ہو گیا ان عمارات کے علاوہ اور مختلف چند چھوٹی چھوٹی عمارتیں بھی تیار ہوئیں اور بعض عمارات کے لئے امدادیں حاصل ہوئیں جو ان کے جانشین کے زمانہ میں تعمیر کی گئیں۔

مالی کامیابیاں

نواب صاحب کی مساعی جمیلہ کے ان نتائج میں جن کی ایک جھلک ان اوراق میں نظر آتی ہے مالی کامیابی اور کالج کے سرمایہ کا استحکام وہ عظیم الشان نتیجہ ہے جس کو بلاشبہ روحِ

نتائج کہا جا سکتا ہے۔

اُنہوں نے پرائیوٹ ملاقاتوں اور پبلک تقریروں کے علاوہ خاص اثرات سے کام لیکر قوم کے تمام طبقات کو کالج کی امداد پر آمادہ کر دیا ابھی تک جن امرا نے کالج کی طرف کبھی توجہ بھی نہ کی تھی اب وہ پوری ہمدردی سے متوجہ ہو گئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کالج کی ترقی مسلمان والیانِ ملک، امرا، ذی اثر افراد اور حکام و حکومت کی رہینِ منت ہے۔ اگرچہ اس کے آغاز کار میں سرسید کے ساتھ مخلص غربا اور اوسط درجہ کی حیثیت والے اصحاب شریک اور معاون و مددگار تھے مگر اس کی موجودہ ترقی یافتہ حالت ان کے حیطۂ قدرت سے باہر تھی اس لئے ناگزیر تھا کہ مذکورۂ بالا طبقہ سے استمداد کی جائے اس لئے ہمیشہ سرسید اور ان کے رفقائے ایسے ہی درجہ کے اشخاص کی توجہات کو کالج کی طرف مبذول کرنے میں ہمت صرف کی اور بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

اب نواب صاحب کی نظر ایک ایسے جلیل القدر وجود یعنی ہز ہائینس آغا خاں پر پڑی جو بہ اعتبار دولت اور بہ لحاظ اثر و رسوخ ہندوستان میں فرد فرید ہے۔

اگرچہ آخر نومبر ۱۸۹۶ء میں جبکہ سرسید زندہ تھے ہز ہائی نس نے کالج کا معائنہ کیا تھا، اور ایڈریس بھی قبول فرمایا تھا مگر کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی۔ نواب محسن الملک نے بمبئی کے قیام میں ہز ہائینس پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ وہ کالج ہی کے شیدا نہیں ہو گئے بلکہ تمام قومی معاملات میں دلچسپی و سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے لگے۔ اس کے علاوہ نہ صرف ان ہی کی جیب خاص سے بلکہ اُن کے اثر و نفوذ[1] سے لاکھوں روپے کالج کو ملتے رہے۔

فروری ۱۹۰۶ء میں جب نواب صاحب سائنس اسکول کی تحریک اور اس کے چندوں کے لئے بمبئی گئے تھے تو ہز ہائی نس نے اپنے بنگلہ پر بڑے بڑے تجار اور ذی اثر و مقتدر اصحاب کو مدعو کر کے نواب صاحب سے ملاقات کرائی اور اس موقع پر نواب صاحب نے ایک نہایت مؤثر تقریر بھی

---

[1] ہز ہائی نس کی کوششوں کا اثر تھا کہ ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے متعلق ایک عام جوش پیدا ہو گیا۔

کی۔ اس موقع پر تمام حاضرینِ جلسہ ہز ہائینس سر آغا خاں کو دیکھ کر دریائے حیرت میں غوطہ زن تھے
اس سے پہلے بمبئی کے مسلمانوں نے جب ان کو دیکھا اسی طرح دیکھا کہ پبلک میں تو وہ گورنر یا گورنر
جنرل یا بڑے بڑے افسروں سے باتیں کر رہے ہیں یا کسی بڑے جلسہ میں کرسی صدارت پر جلوہ فرما ہیں
یا بنگلہ پر بڑے بڑے دولتمند دست بستہ ان کے درشن کے منتظر اور ایک نظر غلط انداز کے متمنی
ہیں یا اس کمیٹی میں یہ حال تھا کہ وہی سر آغا خاں دروازہ تک لوگوں کا استقبال کر رہے ہیں بے خبری
میں کوئی چلا آیا تو تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو رہے ہیں ہر شخص سے مزاج پرسی کر رہے ہیں اس کی
تشریف آوری پر ممنونیت ظاہر کر رہے ہیں یونیورسٹی کی ضرورت بیان کر رہے ہیں لوگوں سے دل
سے محنت و سعی کرنے کے قول لے رہے ہیں۔ کسی کو چاء پلا رہے ہیں۔ کسی کو سگرٹ دے رہے ہیں
لوگوں کو اس انقلاب سے عجیب حیرت تھی اور حیرت کے ساتھ کام کرنے کا شوق بھی پیدا ہو رہا تھا۔

ہز ہائی نس کے علاوہ اور بھی امرا و تجار کو نواب صاحب نے اپنی سحر بیانی سے کالج اور مسلمانوں
کی قومی تعلیم کی طرف رجوع کر دیا۔

ہز ہائی نس کے علاوہ تعلقہ دارانِ اودھ اور نواب صاحبان مرشد آباد پر بھی اثر ڈالا اور
اس طرح انہوں نے اس مختصر مدت میں مختلف فنڈوں وغیرہ کے ذرائع سے گراں قدر رقوم جمع کر لیں
سنہ ۹۹و۹۸ء میں گورنمنٹ گرانٹ، امداد ریاست ہائے دیسی امداد امرا، وظائف و انعام
و منافع پرامیسری نوٹ اور فیس تعلیم وغیرہ سے کل آمدنی ۲۷ ہزار ۵ سو ۳۰ روپیہ تھی لیکن اس کے
بالمقابل سنہ ۱۹۰۷و۸ء میں جو نواب صاحب کے زمانہ کا آخری مالی سال ہے ایک لاکھ ۴۷ ہزار ۶ سو
اکتالیس روپے تیرہ آنے ۶ پائی یعنی بقدر ایک لاکھ اٹھارہ ہزار گیارہ روپے تیرہ آنے زائد تھی۔

ہم تفصیل و جزئیات سے قطع نظر کر کے صرف بڑی بڑی رقوم کا ہی تذکرہ کافی سمجھتے ہیں۔
مستقل آمدنیوں میں گورنمنٹ کی گرانٹ ان ایڈ بہ سلسلہ انتظام تعلیم عربی بجائے بیس ہزار ۶ سو ۰۷
کے [illegible] کردی گئی۔ ہز مجسٹی امیر کابل نے ۶ ہزار سالانہ یومیہ مقرر فرمایا۔ نواب صاحب ڈھاکہ
۱۳ ار ۶ پائی
نے تین ہزار نو سو سالانہ اور ریاست جاورہ اور راجہ صاحب محمود آباد نے چھ چھ سو سالانہ اولڈ بوائز

ایسوسی ایشن نے تین ہزار چھ سو اور ریاست بھوپال نے ایک ہزار دو سو سالانہ کی امداد منظور کی۔

ہز ہائی نس آغا خاں نے دو ہزار پانچ سو سالانہ کی مزید گرانٹ عطا فرمائی۔ ہز ہائینس نواب صاحب رام پور نے بجائے سو روپے ماہانہ کے ۱۱۱ روپے مقرر کئے جو پرامیسری نوٹ خریدے گئے ان کی آمدنی ۶ ہزار ۱۶۲ روپے ایک آنہ ۳ پائی ہوتی ہے۔ الغرض کے وظائف کی آمدنی سنہ ۸-۱۹۰۷ء میں ۱۲ ہزار چھ سو اکتالیس روپیہ چودہ آنہ پانچ پائی تک پہنچ گئی۔

اسی طرح بصورتِ نقد سر آدم جی پیر بھائی تاجر بمبئی نے ایک لاکھ دس ہزار۔ ہز ہائی نس مہاراجہ گوالیار نے ایک لاکھ۔ ہز ہائی نس آغا خاں نے صللعے " ہز مجسٹی امیر کابل نے بیس ہزار راجہ صاحب محمود آباد نے ۳۵ ہزار گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے ۲۰ ہزار۔ نواب صاحب پہاسو نے ۳۰ ہزار راجہ صاحب تصدق رسول خاں تعلقہ دار جہانگیر آباد نے ۲ ہزار اہل رنگون نے ۳۵ ہزار مختلف مدّات کے لئے عطا کیا۔

سر سید میموریل فنڈ اور ون روپی فنڈ میں ایک لاکھ سے زیادہ وصول ہوا۔

اس کے علاوہ اور بہت سی رقوم ہیں جن کو جزئیات کے خیال سے ترک کر دیا گیا مگر ان رقوم کی آخری میزان ۹ لاکھ ۴۲ ہزار سات سو چھ ۱۲ ار ۶ پائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں اتنی رقم کا فراہم کر لینا جو سر سید کی ۳۰ سالہ کوششوں کے نتیجہ سے بھی زیادہ ہے ان ہی کا اعجاز تھا۔

طبقۂ علماء پر کالج کا اثر

نواب صاحب اپنی کوششوں یا یوں کہنا چاہئے کہ اپنی دلربائیوں سے جس طرح جمہور مسلمانان میں کالج کے ساتھ دلچسپی پیدا کرنے میں کوشاں تھے اسی طرح طبقۂ علماء و مشائخ پر بھی اثر ڈالنے کی سعی میں مصروف رہے۔ اور اگرچہ اس سعی و کوشش میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئے تاہم اس قدر کامیابی ضرور ہوئی کہ وہ وحشت و نفرت جو پہلے تھی بہت کم ہوگئی اور مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری نے تو کانفرنسوں میں شریک ہو کر اور نواب صاحب کے ساتھ رنگون کا سفر کر کے اپنی عملی ہمدردی کا بھی ثبوت دیا۔

مولانا عبدالباری صاحب کے خط کا اقتباس

نواب صاحب کے اس اثر کے متعلق مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی (لکھنؤ) اپنے ایک خط موسومہ مؤلف میں لکھتے ہیں کہ:-

''یہ امر ظاہر ہے کہ سرسید کے ساتھ ہم لوگ نہ تو معاندانہ پیش آئے نہ مؤیدانہ پیش آئے اُن کی مذہبی فروگزاشت سے زیادہ ہمارے اکابر کو ان کی سیاست سے بیگانگی تھی ان کے استقلال طبع کے باعث جو خود رائی تھی اس کا تدارک ناممکن تھا اس وجہ سے اکثر مواقع پر تنفر ہو جاتا تھا۔ اس کے اندفاع میں نواب سید مہدی علی خاں صاحب کے ایسے صُلح جو اور متاثر مزاج شخص کی ضرورت تھی اور خدا کی حکمت نے اُن کو انتخاب کیا تھا۔''

گورنمنٹ کی جانب سے اعتراف خدمات

نواب صاحب کو دولتِ آصفیہ سے اگرچہ خانی و بہادری منیر نواز جنگ اور محسن الدولہ محسن الملک کے خطابات حاصل تھے لیکن انگریزی گورنمنٹ کی جانب سے ان کی پبلک خدمات اور قابلیتوں کے اعتراف میں ہمیشہ تغافل و تساہل ہی ہوا حالانکہ نواب صاحب ان خدمات کے لحاظ سے بھی جو انہوں نے حیدرآباد میں انجام دی تھیں ایسے اعزاز کے مستحق تھے اور ۱۸۸۸ء میں ایچ ایم ڈیورینڈ صاحب چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے لندن میں مقدمۂ معدنیات کی عمدہ کارروائی پر تحسین کرتے ہوئے ان کو ایسے اعزاز کا امیدوار بھی بنایا تھا اور لارڈ ڈفرن نے صاف طور پر افسوس کیا تھا کہ وہ اپنے عہد میں نواب صاحب کو خطاب نہ دے سکے اور اس کی تلافی کی غرض سے سرکاری طور پر اعتراف خدمات کے لئے آمادہ تھے۔ اب ۱۹۰۶ء میں اُن کی خدمات مزید برآں فہرست[1] خطابات میں بھی اُن کا نام درج ہو گیا تھا۔

---

[1] انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ ۱۹ء کے خطابات نوروز میں اُن کا نام تھا جس کے متعلق اخبار ٹائمز آف انڈیا کی اشاعت ۱۲ جنوری ۱۹ء کا اڈیٹوریل نوٹ پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

''ہم اس خبر کو سن کر خوش ہوئے ہمارے نزدیک ہندوستان کے تمام طبقہ نائٹ میں نواب محسن الملک مرحوم سے بڑھ کر کسی کا نام اس اعزاز کے لائق نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم اور اردو لٹریچر کی ترقی کے باب میں اُن کی خدمات تنہا ''گریٹ سرسید'' ہی سے (باقی نوٹ بر صفحہ آئندہ)

ملکی اور پبلک کاموں کی قدر دانی "قیصرۂ ہند" کے طلائی تمغہ سے کی گئی۔

تمغہ دیتے وقت ہز آنر کی تقریر ۳۰ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہز آنر سر جیمس لاٹوش علی گڑھ تشریف لائے اور ان کی خدمت میں ٹرسٹیوں کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا اور اسی موقع پر نواب محسن الملک کو قیصرۂ ہند کا طلائی تمغہ بھی مرحمت کیا گیا۔ تمغہ دیتے وقت ہز آنر نے کہا:-

"دوسرا فرض یہ ہے کہ میں اپنے دوست آنریری سکرٹیری مدرستہ العلوم علی گڑھ کو تمغہ طلائی قیصرۂ ہند پہناؤں جو ہز اکسیلنسی ویسرائے ہند نے ان کو عطا فرمایا ہے۔ مجھے اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ یہ عزت صرف ان لوگوں کو بخشی جاتی ہے جو اپنے ہمعصر لوگوں کی بے لوث خدمت کرتے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ ہندوستان کی فلاح کے لئے اپنے کو وقف کر دیتے ہیں سرسید کی وفات کے بعد سے میں نے مولوی سید مہدی علی خاں کے کارناموں کو بغور دیکھا ہے اور مجھ کو معلوم ہے کہ ان کی جانفشانی، خوش بیانی اور صائب رائے کالج کی غیر معمولی ترقی کی کس قدر باعث ہوئی ہے انہوں نے علی گڑھ میں محسن الملک (یعنی ملک پر احسان کرنے والا) کا خطاب دوبارہ حاصل کیا ہے جس نام سے کہ وہ زیادہ

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) دوسرے نمبر پر تھیں۔ وہ معاملات کو فریقانہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے وہ پورے معنوں میں ایک محبِّ وطن ہندوستانی تھے اور ان کی پبلک خدمات فرد تھیں اور اُن کے شریفانہ کیرکٹر سے ملکر جس میں یہ خوبی تھی کہ سب لوگ یہاں تک کہ معاملاتِ ملکی میں ان سے اختلاف رائے رکھنے والے بھی اُن سے محبت رکھتے تھے، نہایت شیریں اور خوش گوار ہو گئی تھیں۔ ہم ہمیشہ یہ خیال کرتے رہے کہ گورنمنٹ نے اُن کی اعلیٰ پبلک خدمات کا منصفانہ اعتراف کرنے میں کسی قدر کوتاہی کی کہ نواب محسن الملک کو تمغائے "قیصر ہند" کے علاوہ کسی اور اعلیٰ اعزاز کے عطا کرنے کے بغیر مرجانے دیا لیکن اس سے کسی قدر آنسو پچھ جاتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہتے تو اُن کے کاموں کی زیادہ مناسب طور پر قدر کی جاتی اور اس خبر سے نواب مرحوم کے دوست ضرور مطمئن ہوں گے اور ہم کو بھی صاف طور پر نظر آگیا کہ اُن کا چپ چاپ کام اعزازوں کے سرچشمہ پر فراموش نہیں کیا گیا۔"

ترمشہور ہیں اللہ یحب المحسنین (زور سے چیرز)"

نواب صاحب کا جواب

نواب صاحب نے اس عزت افزائی کے شکریہ میں کہا کہ:-

"جو عزت ہز امپیریل مجسٹی قیصرۂ ہند کی طرف سے مجھے دی گئی ہے میں اس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور ہر فرد رعیت کے لئے جو عزت کہ اس کے بادشاہ کی طرف سے ملے نہایت فخر اور قدر کے لائق ہے اور مجھے اس کی خوشی زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ اُس مبارک ہاتھ سے مجھے یہ تمغہ ملا ہے جس نے اپنے زمانۂ حکومت میں نہ صرف ایک فرمانروائے صوبہ کی حیثیت سے کام کیا ہے بلکہ بطور ایک محسن اور مربی کے ہر شخص کا لحاظ رکھا ہے اور جس کے زمانۂ حکومت میں ہر ملت و مذہب کے لوگ اُس کے احسان و مہربانی و شفقت سے اُس کے گرویدہ ہو رہے ہیں اور جو احسان کہ مجھ پر آپ نے کئے ہیں وہ بیان نہیں ہو سکتے مگر حضور والا اس کہنے کی میں معافی چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو شخص کوئی خدمت اپنے ملک اور اپنی قوم کی کرے اس کی خدمت کا صلہ خود اس کی خدمت ہونی چاہیے نہ کہ کوئی خطاب یا ڈکوریشن اس لئے کہ اس سے اُس کی بے ریا اور پاک خدمت میں خود غرضی کا خیال پیدا ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی۔

صلہ خواہش۔ سچے دل سے بے غرض خدمت کرنے پر محدود نہیں رکھتی کاش میں ایسا خوش نصیب ہوتا کہ میری ناچیز خدمت اگر درحقیقت کوئی خدمت ہے کسی صلہ یا تمغہ کے ملنے سے پاک رہتی اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی صلہ میرے لئے تجویز کیا جاتا ہے تو میں نہایت ادب سے اس کی معافی چاہتا مگر اس سے حضور یہ خیال نہ فرماویں کہ اس شاہی عطیہ کی میں قدر نہیں کرتا بلکہ میں درحقیقت اس کی بڑی عزت کرتا ہوں اور اس خیال سے کہ یہ بڑا ثبوت آپ کی خوشنودی اور مہربانی کا ہے سب کا نہایت شکرگزار ہوں۔

حضور والا! آپ نے اپنے زمانۂ حکومت میں جو احسان کالج پر کئے ہیں اور آپ کے مبارک عہد میں کالج نے جس قدر ترقی کی ہے اس کے عام مسلمان جو اس وقت موجود ہیں ممنون ہیں

اور آئندہ ان کی نسلیں شکر گزار رہیں گی اور آپ کا نام نامی ہمیشہ مسلمانوں کے صفحۂ دل پر کندہ رہے گا ہم سب کی دعا ہے کہ خداوند عالم آپ کو اپنے وطن میں شاد اور تندرست رکھے اور آپ اپنے وطن میں بھی ہم کو اور ہمارے کالج کو یاد اور اس کی مدد کرتے رہیں۔"

طلباء کی خوفناک ہڑتال

بنیاد کالج کے وقت سے یہ کوشش ملحوظ رکھی گئی تھی کہ اساتذہ (ممبران انگلش اسٹاف) اور طلباء کے درمیان سوشیل تعلقات نہایت خوشگوار رہیں اور ان دونوں میں عزیزانہ اعتماد اور بھروسہ پیدا ہو۔ ایک عرصہ تک یہ حالت قائم رہی اور ان عمدہ اور خوشگوار تعلقات کی قابل احترام روایتیں قائم ہوگئیں جو نئے داخل ہونے والے طالب علم اور ہر ایک جدید پروفیسر کو بطور ورثہ سپرد ہوتی تھیں۔

طلباء و اساتذہ کے تعلقات میں کشیدگی

لیکن بدقسمتی سے ۱۹۰۰ء سے یورپین اسٹاف اور طلباء کے تعلقات بہت زیادہ کشیدہ ہوگئے تھے اور اساتذہ نے کچھ ایسا طرز عمل اختیار کیا تھا جس میں نفرت و حقارت کے جذبات نمایاں تھے۔ رفتہ رفتہ علاوہ جزئی اور معمولی شکایتوں کے یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی اور اس قسم کی مثالیں موجود ہوگئی تھیں کہ ایک اُستاد نے ایک طالبعلم کے مربّی کو جو اسکول کے قریب ٹہل رہا تھا ٹھوکر ماری اور اُسی اُستاد نے ملازمین کالج کے موذن کو اذان دینے سے روکا۔ بعض پروفیسروں نے طالب علموں کی موجودگی میں ٹرسٹیوں اور بعض ذی اقتدار مسلمانوں کی نسبت جن کی طلباء نہایت عزت کرتے تھے چند جملے تحقیر کے کہے۔ محمود بیگم[1] جو تنہا رہتی تھیں اُن کے چوکیدار کو رات کے وقت اپنے بنگلہ پر گشت کی آوازیں دینے کے باعث جو پروفیسر صاحب کو ناگوار تھا سزا دلائی گئی۔

ایک پروفیسر نے کلاس میں کہا کہ "بیک صاحب کو کالج سے محبت تھی، ماریسن صاحب کا دعا تھا کہ اُن کو کالج سے محبت ہے اور میں کالج سے نفرت رکھتا ہوں۔"

ایک پروفیسر طلباء کے سوالات سے ناراض ہو کر درشت برتاؤ کرتے تھے۔

---

[1] سید محمود مرحوم کی بیگم صاحبہ۔

۱۹۰۶ء میں طلباء نے اپنی شکایات کا ایک میموریل تیار کر کے سید مصطفٰے حسین[1] نامی ایک طالب علم کے ذریعہ سے پرنسپل کے سامنے پیش کیا جس پر اُن کو کالج اور بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء میں پھر جبکہ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کی سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس میں بہ حیثیت ممبر کمیٹی شریک ہونے کے لئے آنریری سکرٹیری کی دعوت پر آئے تو عین جلسہ میں پرنسپل نے کہا کہ:۔

"میں یا مصطفٰے حسین دونوں میں سے کوئی ایک میٹنگ سے چلا جائے"

چنانچہ مصطفٰے حسین میٹنگ سے چلے گئے۔

بعض طلباء کو جنہیں ڈیوٹی سے وظیفہ ملتا تھا کلاسوں میں وظیفہ بند کرنے کی دھمکی دی گئی غرض اسٹاف کا برتاؤ دردناک حالت تک پہنچ گیا تھا اور ہندوستانی اسٹاف کے بعض ممبروں کا بھی اپنے سفید فام افسروں کی تبعیت میں اخلاق بگڑ گیا تھا۔

طلباء میں بددلی

ان حالات میں طلباء کو یقین ہو گیا تھا کہ اسٹاف اور ٹرسٹیوں میں سے کسی کو بھی اُن کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔ ان اسباب سے بے اعتمادی اور ناراضی کا مادہ اندر ہی اندر تیار ہو رہا تھا۔ وہ مضامین جو اکثر اخبارات میں طلباء کی حمایت میں نکلتے رہتے تھے اس مادہ کو اور پکا رہے تھے۔

اسٹرائک اور اُس کا سبب

بالآخر ۹ فروری ۱۹۰۷ء کو وہ مادہ آتشگیر مادّہ کی طرح پھوٹا اور اتنی شدت کے ساتھ کہ کالج کی بیخ و بُن تک اثر پہنچ گیا۔

فروری ۱۹۰۷ء کی نمائش کے موقع پر کالج کے ایک طالب علم راجہ غلام حسین[2] اور پولیس

---

۱ یہ کالج کے ایک مشہور طالب علم ہیں جو اب ڈپٹی کلکٹر ہیں اُنہوں نے ڈیوٹی ڈپوٹیشن میں جبکہ یہ اُس کے سکرٹیری تھے ہزاروں روپیہ جمع کیا تھا۔ ۲ نہایت قابل آدمی تھے اور انگریزی لٹریچر سے خاص ذوق تھا۔ ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ سے ایک انگریزی اخبار نیو ایرا جاری کیا تھا لیکن ملک کو اُن کی قابلیت سے مستفید ہونا مقدر نہ تھا۔ ایک اتفاقی حادثہ

کے ایک سپاہی میں کچھ جھگڑا ہو گیا جس کی اطلاع سُپرنٹنڈنٹ پولیس نے پرنسپل کو دی اور پرنسپل نے غلام حسین کو ایک جرم کی پاداش میں متعدد سزائیں دیدیں۔ چونکہ طلبا اُن کو بے قصور جانتے تھے اور تنازعہ کا الزام کانسٹبل پر رکھتے تھے اس لئے اُنہوں نے پرنسپل سے غلام حسین کی سفارش کی اور کانسٹبل کو سزا دلوانے پر اصرار کیا مگر یہ درخواست مسترد کر دی گئی اور پھر کچھ واقعات اور کچھ غلط فہمیوں کے باعث جوش بڑھتا گیا اور بالآخر ۱۵ فروری کو طلبانے اسٹرائک کر دی۔ نگر سکرٹیری اور مقامی و بیرونی ٹرسٹیان نے جو اس واقعہ کی خبر سنکر آ گئے تھے اُنہوں نے سکرٹیری کے اتفاق سے طلباء کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ غلام حسین کی سزا مان لیں اور اپنی طرف سے بلا شرط معذرت نامہ پیش کریں اور اب کسی کو سزا نہیں دی جائیگی اس تیقن پر اُنہوں نے معذرت نامہ پیش کر دیا مگر ۲۰ فروری کو پرنسپل نے چھ اور طلبا کو کالج چھوڑ دینے کا حکم دیا جس نے طلباء میں تھلکہ ڈال دیا۔ طلباء نے نواب صاحب کو اُن کا وعدہ یاد دلایا لیکن اُنہوں نے اپنی بے بسی ظاہر کی اور بالآخر یکم اپریل تک کالج بند ہو گیا۔

اسٹاف کا نقطہ نظر

اسٹاف کے نزدیک اس شورش کے اسباب میں پولٹیکل خیالات کی تبدیلی ایک وجہ معاون ظاہر کی گئی جس کو مسٹر گاڈر براؤن اور مسٹر ٹول نے بیان کیا اور یہ بھی بیان کیا گیا کہ چند کانگریسی اخبار یونین میں آتے ہیں اُن کے پڑھنے سے طلباء کے قلوب اثر پذیر ہوتے ہیں اور اس کے ثبوت میں لڑکوں کی شورش کے بعد کانگریسی پارٹی[1] نے جو روپے کی امداد کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اُس کو بیان کیا۔ حالانکہ یہ صرف واہمہ ہی واہمہ تھا۔ اور عین ہیجان و جوش کے زمانہ میں بھی طلباء سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہوئی جس سے اس بیان کی صداقت کا قیاس بھی ہوتا۔

طلباء کی دانشمندانہ کارروائی

طلباء نے گورنمنٹ میں ایک مفصل تار بھیجکر ان خیالات کی تردید کر دی اور طلباء کی باقاعدہ جماعت کے سکرٹیری نے باضابطہ طریقہ سے نواب صاحب کو بھی اس امر کا

۱؎ یہ ایک غلط افواہ مشہور کر دی گئی تھی کہ کانگریسی لیڈر طلباء کو اسٹرائک قائم رکھنے کے لئے مالی امداد پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اطمینان دلادیا۔

تحقیقاتی کمیشن — اس شورش کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن قائم ہوا اور اس نے شکایات و اسباب شورش کی تحقیقات کر کے آئندہ اُن کے انسداد کی تجاویز کیں اور پالٹیکس سے شورش کا تعلق قطعی بے بنیاد قرار دیا۔

نواب صاحب کے قلب پر ہڑتال کا اثر — لیکن یہ شورش اور ہڑتال خواہ وہ قطعی وجوہ یا نیم واقعی اور فرضی وجوہ پر تھی اس سے نواب صاحب کے قلب پر بہت سخت اثر پڑا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۰۶ء اور جنوری ۱۹۰۷ء میں کالج نے جو وقار حاصل کیا اور جو عالی کامیابیاں ہوئیں اُس سے جس قدر مسرت نواب صاحب کو ہوئی تھی وہ اُس شورش سے خاک میں مل گئی۔ اُن کی ہمت ٹوٹ گئی اور دل بیٹھ گیا۔ اس حالت کا اندازہ کسی قدر اُن خطوط[1] سے ہوسکتا ہے جو اسی زمانہ میں جبکہ شورش کا زور تھا۔ نواب صاحب نے طلباء کے نام لکھے ہیں اور ناممکن ہے کہ کوئی شخص بغیر چند قطرات اشک ٹپکائے ان کو پڑھ سکے۔

سر جان ہیوٹ کی تشریف آوری — وسط مارچ میں ہز آنر سر جان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر معائنہ کالج کے لئے تشریف لائے۔

اگرچہ اس موقع پر ہز آنر سر جان ہیوٹ نے بہت کچھ حوصلہ افزائی اور ہمدردی کی۔ انگریزی اخبارات بھی جن کا زیادہ خوف تھا نواب صاحب کی حمایت میں تھے حتےٰ کہ پانیر جیسے اخبار نے بھی ہز آنر کی وزٹ پر ہمدردی آمیز نوٹ[2] لکھا تھا۔

---

[1] یہ خطوط مکاتیب میں شائع ہوگئے ہیں۔

[2] **پانیر کا نوٹ** — یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ہز آنر لفٹنٹ گورنر کا بروقت علی گڑھ تشریف لے جانا، کالج اسٹاف اور طلباء کے درمیان جو افسوسناک قضیہ پیش آیا ہے اُس کے تصفیہ میں بہت معاون ہوگا۔ سر جان ہیوٹ نے اپنی پبلک اسپیچ میں اس واقعہ کے اسباب کے ساتھ بہ استقلال پیش آنے کی اہمیت ٹرسٹیوں کے ذہن نشین کی اور بلاشبہ پرائیوٹ مشورہ میں اس معاملہ کے متعلق ہز آنر نے زیادہ تفصیل کے ساتھ ٹرسٹیوں سے گفتگو کی ہوگی۔ (باقی نوٹ بر صفحہ آئندہ)

سکریٹری شپ سے استعفا اور اُس کی واپسی اُنہوں نے ان حالات سے مایوس ہو کر ۲ مارچ ۱۹۰۰ء کو اس بارِ گراں سے سبکدوشی کی استدعا کی اور ٹرسٹیوں کے سامنے استعفا پیش کر دیا۔ اور اس کی منظوری پر بے انتہا اصرار کیا لیکن ہر طرف سے بہی خواہان و ہمدردانِ کالج کے نواب صاحب کے پاس صدہا خطوط موصول ہوئے جن میں اُن سے التجا کی گئی تھی کہ وہ ایسے نازک وقت میں سکریٹری شپ سے علیحدہ نہ ہوں، اپنے استعفے پر نظرِ ثانی کریں اور قوم پر رحم کریں اور کالج کو مشکلات کے بھنور میں چھوڑ کر جدا نہ ہوں۔

ان خطوط کے علاوہ تمام انگریزی[1] و قومی[2] اخبارات نے بھی اپنا دلی رنج و افسوس ظاہر کر کے اصرار کیا کہ نواب صاحب استعفا واپس لیں۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) ایسے قضیہ کی نسبت جس کے متعلق واقعات بہت ناقص طور پر معلوم ہیں کوئی رائے ظاہر کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ طلبا رکا طرزِ عمل ہرگز بلا وجہ دشمنی کا نہیں ہو سکتا۔

طلبار کی کمیٹی نے جو خط ٹرسٹیوں کے سکریٹری کے نام لکھا ہے جسے ہم اپنے اخبار میں نقل کرتے ہیں ایسے لوگوں کی تحریر معلوم ہوتی ہے جن کا اپنے کالج کے ساتھ مہر و وفا کا قوی احساس اُن شکایات سے جن کو وہ اصلی اور واقعی کہتے ہیں قطعاً غیر متاثر رہی۔ طلبا میں اس قسم کی اسپرٹ کو زندہ پانے سے جس طرح یہ امید ہوتی ہے کہ بقول مسٹر جان موٹ

"برائی سے بھلائی جلوہ گر ہوگی اور موجودہ پریشانی سے نکل کر کالج اُس خوش حالی سے جو اُسے اب تک نصیب رہی نسبتہً زیادہ خوشحالی کے دور میں جنم لے گا۔"

[1] ٹائمز آف انڈیا کا نوٹ ۔ نہ صرف مسلمانوں ہی میں بلکہ اور بہت سے لوگوں میں نواب محسن الملک کے علی گڑھ کالج کے سکریٹری شپ سے عنقریب مستعفی ہونے کی خبر دور و نزدیک بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی۔ نواب محسن الملک نے علی گڑھ کے لئے سخت کوششیں نہایت صداقت اور بے غرضی کے ساتھ کی ہیں اور مسلمانوں کی تعلیم کی عظیم الشان ترقی اُن کی سچی گرم جوشی کا نتیجہ ہے۔ ایک مدت دراز تک کام کرنے کے بعد جبکہ زمانہ آرام کا تھا انہوں نے علی گڑھ کالج کا کام اپنے ذمہ لیا جو ایثار علے النفس اور سچے جوش کی ایک ایسی مثال ہے کہ آئندہ نسل کے نوجوانوں کو اُس کی تقلید کرنی چاہیے۔

(نوٹ نمبر ۲ بر صفحہ آئندہ)

ٹرسٹیوں نے بھی ایک میٹنگ میں نواب صاحب پر اظہار اعتماد اور خدمات کا اعتراف کر کے رزولیوشن پاس کر کے استعفا نامنظور کیا نواب صاحب نے مجبور ہو کر واپس لے لیا۔ اس خبر نے مسلمانوں کے افسردہ دلوں میں شگفتگی پیدا کر دی اور کالج کے مستقبل کی طرف سے بڑی حد تک اطمینان ہو گیا۔

اس موقع پر اولڈ بوائز کا جلسہ بھی ہوا اس میں نئے اور پرانے طلباء اسٹاف اور ٹرسٹیوں کی طرف سے پُرجوش اور دلچسپ تقریریں ہوئیں جن میں گزشتہ کو فراموش کرنے اور آئندہ اعتماد و رواداری اور طلباء و اسٹاف کے خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کا عہد و پیمان تھا۔

مؤلف کا تبصرہ اس میں شک نہیں کہ یہ اسٹرائک اندرون کالج کے نظم و نسق کی خرابی کے سبب سے رونما ہوئی اور سرسید کے آخر عہد میں اور نواب صاحب کے ابتدائی زمانہ میں جو حالات رونما ہو گئے تھے اُن سے جماعت ٹرسٹیاں اور سکرٹیریاں کا اثر ممبرانِ انگلش اسٹاف کے دلوں سے زائل ہو گیا تھا اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ سکرٹیری اور پرنسپل کے حدود اختیار اور کاموں کی صراحت و تشریح

(نوٹ نمبر ۲ صفحہ گزشتہ) ۵۲ وکیل امرتسر

"اس امر کی ضرورت نہیں کہ ہم نواب صاحب ممدوح کی خدمات قومی گنوائیں اور محمڈن پبلک سے اُن کا اعتراف کرائیں کیونکہ وہ سرسید مرحوم کی حیات بھر اُن کا دایاں ہاتھ رہے اور اُن کے مرنے پر انہوں نے مثیل کی حیثیت سے کام کیا۔ اس قومی آفتاب کے غروب ہونے کے بعد انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی تیرہ و تار فضا کو بدر منیر بن کر منور رکھا۔ نواب صاحب کی ذات انسانی تعریف سے مستغنی ہے۔ اُنہوں نے قوم کی خدمت کسی تعریف و ثواب کی نظر سے نہیں کی بلکہ محض اپنا ایک مقدس فرض سمجھ کر گو اُن کے مدِنظر نہ ہو۔ مگر اس کا اجر صرف خدائے تعالیٰ کے ہاں اُن کو ملے گا۔ نواب صاحب قبلہ کی ٹون ہم کو سخت صدمہ پہنچا رہی ہے اور اُن کا خاص کر یہ فقرہ کہ "اگر جون تک میرا باضابطہ استعفا منظور نہ ہوا تو میں اپنے کام کا چارج جائنٹ سکرٹیری کو دیکر اور کام چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور کسی کام کا ذمہ دار نہ ہوں گا" یہ الفاظ نہ صرف ہمارے بلکہ قوم کے خرمنِ امید پر بجلی گرا رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ نواب صاحب قبلہ ایک دفعہ پھر اس رائے پر نظرثانی فرمائیں گے اور بدنصیب مسلمانوں کی کشتی کو طوفان خیز سمندر کے رحم پر چھوڑ کر علیحدہ نہیں ہوں گے۔"

نہ تھی۔ طلبار کی تعداد میں روزافزوں ترقی تھی اور وہ بھی اپنے حدود سے نکل گئے تھے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر صورت میں آنریری سکرٹیری کو اپنا رعب اور اثر قائم رکھنا چاہیے تھا لیکن اگر اُن حالات و مشکلات میں جن کو ہم نے اس باب میں کسی قدر اجمال کے ساتھ دکھایا ہے اقتدار اور رعب و اثر کی طرف توجہ کی جاتی تو اور زیادہ اہم اور قوی تر مشکلات پیدا ہو جاتیں اور یہ یقینی بات تھی کہ انگلش اسٹاف اور طلبا اور ٹرسٹیوں کی حمایت میں جو فرقہ بندی ہوتی وہ سخت کشمکش میں ڈال دیتی اور اس کشمکش میں بہترین اغراض کو ہی صدمہ نہ پہنچتا بلکہ کالج ایک بوسیدہ دیوار کی طرح بیٹھ جاتا۔ قوم میں اس وقت اتنی جرأت و فیاضی نہ تھی کہ وہ انگلش اسٹاف کے برخلاف سکرٹیری کی مدد کرتی۔ کہنے کے لئے ٹرسٹیوں کی ایک با اثر جماعت موجود تھی جو ہر موقع پر سکرٹیری کی جائز حمایت کرتی لیکن اس جماعت میں جس طبقہ کا بڑا عنصر تھا اس وقت اُس سے یہ امید ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ انگلش اسٹاف کے خلاف اگر کوئی کارروائی کرنی پڑیگی تو وہ سکرٹیری کا ساتھ دے گی۔

یہی اسباب تھے کہ اندرونی خرابیوں کا علاج نہ ہوسکا لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نواب محسن الملک ان خرابیوں کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ بلاشبہ اُن میں ایک حد تک وہ کمزوری تھی جو انتہائی مروت کا لازمی نتیجہ ہے مگر مسلّمہ طور پر وہ جلیل القدر منتظم اور صاحب تدبیر تھے اور کھلم کھلا کشیدگی اور کشمکش سے دور رہکر اپنی مخصوص حکمت عملی اور حسن تدبیر سے ان مشکلات کو حل کرنا چاہتے تھے وہ محض قوم اور کالج کے اعلیٰ مفاد کی خاطر ہر ایک ایسی بات سے چشم پوشی کرتے تھے جو نتیجہ میں کسی ناخوشگواری کا باعث ہو۔ خواہ اس کو اُن کی بزدلی، کمزوری اور خوشامد پر ہی کیوں نہ محمول کیا جاتا۔

ان باتوں کی صداقت، بعد کے اُن واقعات سے ظاہر ہوتی ہے جو نواب وقار الملک کے زمانہ میں خود انگلش اسٹاف کے متفقہ استعفے سے پیش آئے۔

مایوسانہ حالتیں نواب صاحب کی جان فشانیوں، شبانہ روز کی محنتوں، سرگرمیوں اور قابل رشک کامیابیوں کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ان کی غم انگیز اور مایوسانہ

حالتوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

اس زمانہ میں جو ماحول تھا اس سے نہ صرف ان کی جسمانی تکلیفات میں ہی اضافہ نہیں ہوتا تھا بلکہ روحانی تکلیفات پیدا ہو جاتی تھیں اور ان کا جی چھوٹ جاتا تھا اور بسا اوقات کوئی نہ کوئی روحانی تکلیف ہی ان کے امراض کے عود کر آنے کا سبب بن جاتی تھی۔

جب ان کو اپنے رفیقانِ کار سے اس قسم کی تکلیف پہنچتی تھی تو اگرچہ وہ اپنے صبر و تحمل اور فطری کشادہ دلی اور وسعتِ قلبی سے اس کا مقابلہ کرتے تھے تاہم دل پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا تھا۔

~~۱۹۰۴ء~~ میں نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں کہ:-

"جناب من نواب وقار الملک بہادر! میں بہت خستہ ہو گیا ہوں اور اب محنت اور تکلیف اٹھانے کے آثار معلوم ہوتے ہیں مگر اب بھی اس قدر کام ہے کہ آرام لینے کے لیے بمبئی بھی نہیں جا سکتا، اجلاس ٹرسٹیوں کا ہو گیا جس نے بھٹیار خانہ کا شور و غل دیکھا ہو گا اس کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مجلس اُس سے بڑی ہوئی تھی ایسا شور و غل ہوا اور ایسی بے تہذیبی اور بیہودہ تکرار اور پارٹی فیلنگ کی کارروائی ہوئی کہ جس کو دیکھ کر نہایت شرم آئی۔ . . . . مولوی صاحب قوم کی نہایت افسوس ناک حالت ہے ساری کوششیں بے سود ہیں جو لوگ قومی کام میں وقت صرف کرتے ہیں وہ صرف اپنی عادت سے مجبور ہیں ورنہ قوم پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہوتا افسوس ہے کہ آپ بہ ضرورت تشریف لے گئے اور جلسہ میں شریک نہ ہو سکے ورنہ ایسی کارروائی نہ ہوتی۔"

اسی طرح ایک دوسرے خط میں لکھا تھا کہ:-

"میری طبیعت قریباً بدستور ہے آثار مرض کم ہو گئے ہیں زہریلا مادہ جو پیدا ہو گیا تھا وہ بھی جاتا رہا ہے مگر ضعف بدستور ہے اور طبیعت کی سستی قائم ہے کام تو کچھ ہو نہیں سکتا اور آج کل کام کی وہ کثرت ہے کہ رات دن اس کے لئے کافی نہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پرنس کی فرسٹ

کا کیا انجام ہوگا اور اس کا کیا انتظام ہوگا اور روپیہ کہاں سے آئیگا اسی طرح کانفرنس کا حشر بھی معلوم نہیں کہ کیا ہوگا علی گڑھ سے جو خبریں آئی ہیں وہ یہ ہیں کہ کوئی کام کرنے والا نہیں ہے۔ اور کچھ کام نہیں ہوا کمیٹیوں کی تاریخیں مقرر ہوتی ہیں اور کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے کارروائی نہیں ہوتی۔ یہ حالت تو ان کاموں کی ہے جن میں کسی کا خوف اور اندیشہ نہیں ہے اس کام کی کیا امید ہے جس میں حکام کی ناراضی کا خیالی اندیشہ ہو ہم لوگوں کی حماقت ہے جو آرام چھوڑ کر قومی کاموں کے خبط میں گرفتار ہیں“

نواب صاحب انسان تھے اور انسان ہی سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں وہ بھی غلطیاں کرتے تھے مگر بعض اوقات ان غلطیوں پر ایسے بیدردانہ اعتراضات کئے جاتے تھے جس میں ان کے احترام اور ان کی خدمات واحسانات تک کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا ایسی صورت میں ان کے دل پر سخت چوٹ لگتی تھی۔

اسٹرائک کے بعد اگرچہ قوم نے ان پر ہر گونہ اعتماد کا اظہار کیا تھا لیکن پھر بھی ایسی آوازیں نکلتی تھیں جو حوصلہ شکن تھیں اور پھر ایسے زمانہ میں جبکہ ان پر امراض کا حملہ بھی شروع ہو گیا تھا اس وقت سے زیادہ کبھی ان پر ان اعتراضات کا اثر نہیں پایا جاتا جس کا کسی قدر اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے مولوی عبداللہ جان مرحوم (کالج کے مشہور ٹرسٹی) کو بمبئی سے لکھا تھا:۔

”عنایت نامہ پہنچا میری طبیعت کا کیا حال پوچھتے ہو آپ سب صاحب میری جان کے دشمن ہو کہ جو آپ نجات نہیں دیتے آپ صاحبان سمجھ لیں کہ میرا رنج اور غم اور بیماری اب جاویگی جب تک میں کالج کا سکرٹیری رہوں گا۔ بہت گالیاں کھائیں بہت آفات سہے مگر اب گالیاں کھانے کی طاقت ہے نہ اپنے معزز ٹرسٹیوں کی طرف سے باضابطہ ذلیل ہونے کی ہمت ہے اور نہ کالج کو جنگ وجدل کا اکھاڑہ بنانا منظور ہے ورنہ میں بھی سینہ میں دل اور منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم رکھتا ہوں چپ چاپ گالیاں سننا اور اپنے آپ کو باضابطہ اور علانیہ

ذلیل ہونا گوارا نہیں کر سکتا مگر کمبخت مسلمان کچھ ایسے ہی بدنام ہیں میں کچھ بولوں تو پھر وہی زمانہ آجائے جو سید محمود کے زمانہ میں مرزا عابد علی بیگ صاحب نے پمفلٹ شائع کئے تھے اس لئے بابا میں نالائق ہوں مجھے نہ قوم کا درد نہ اپنے عہدہ کی عزت کی پروا نہ لڑکوں پر رحم انگریزوں کا غلام اور بے ایمان مگر کیوں ایسے شخص کو رکھتے ہو خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ایسی حالت پر پہنچ گیا ہے کہ برداشت نہیں کر سکتا۔

میں اس وقت ایک خاص وجہ سے مجبور ہو گیا ورنہ اب میں ایک دن کے لئے سکرٹری رہنا منظور نہ کرتا اور اس کا مجھے رنج ہے اور سچ پوچھو تو یہی میری بیماری ہے اور میں بیماری کا مشکور ہوں کہ اس نے اس زمانہ میں بڑی مدد کی اور دشناموں اور گالیوں کے اکھاڑے میں آنے سے روکا خدا میری بیماری کو میری مدد کے لئے قائم رکھے تاکہ سامنے گالیاں کھانے سے بچتا رہوں۔"

(۲) سیاسی

آغاز تحریک اور مسلمانوں کی خاص پالیسی

ہندوستان میں سیاسیات کی تاریخ در اصل اس ایجی ٹیشن سے شروع ہوتی ہے جو ۱۸۷۴ء میں چند تعلیم یافتہ بنگالیوں کی کوششوں سے بنگال میں شروع ہوا تھا اور جس کے بعد ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل کانگرس" عالم وجود میں آئی۔ سر سید نے جو مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے ۳ سال تک کانگرس کا مطالعہ و تجربہ کرنے کے بعد جب دیکھا کہ وہ مقاصد و خیالات میں معتدل اور معقول نہیں ہے اور اس کے مطالبات اہم یعنی متعہد عہدوں کے لئے انگلستان میں امتحانات کی منسوخی، غیر متعہد عہدوں کے لئے امتحان مقابلہ کا لزوم، لائسنس اسلحہ کی تنسیخ، ہندوستانیوں کو والنٹیر بنائے جانے کی رعایت، کونسلوں میں پارلیمنٹری طریقہ انتخاب و نیابت کا اجرا، بجٹ کی منظوری و نامنظوری کا اختیار، وغیرہ وغیرہ، حالاتِ موجودہ میں مسلمانوں کے مناسب نہیں، اور نہ قلیل التعداد اقوام کے مفاد کا اس میں کافی لحاظ کیا

گیا ہی انہوں نے بلا تامل اور علانیہ طور پر ۲۔ دسمبر ۱۸۸۷ء اور ۱۶۔ مارچ ۱۸۸۸ء کو لکھنؤ اور میرٹھ میں ان مطالبات اور دیگر مطالب کی نسبت دو زبردست تقریریں کرکے اپنی قوم کو کانگرس میں شرکت کے نقصانات سے آگاہ اور متنبہ کیا۔ اور ان نقصانات سے مسلمانوں کی حفاظت کی ایسی مختلف تدابیر اختیار کیں کہ ان کا رجحان سیاسیات کی جانب نہ ہو اور تعلیمی، تمدنی، معاشرتی اور اقتصادی ترقیات کو جن میں کہ وہ تمام اقوام ہند سے پسماندہ تھے اپنی توجہات کا مرکز بنالیں اور کانگرسی گروہ، بے اعتمادی، شورش اور مجاہرات و مطالبات سے جو فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے ان کو مسلمان حکومت کے ساتھ اعتماد و ہمدردی اور اتحاد سے حاصل کریں

مسلمانوں کی مخصوص انجمنوں کا قیام

ان ہی اغراض کو ملحوظ رکھکر انہوں نے ۱۸۸۶ء میں تعلیمی کانفرنس اور ۱۸۹۳ء میں "محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفینس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" قائم کی۔ مسٹر بیک پرنسپل کالج اس پولٹیکل ایسوسی ایشن میں بھی ان کے معاون تھے۔

ایسوسی ایشن کے قیام کے وقت چار طریقے مسلمانوں کے سامنے پیش کیے گئے تھے

(۱) ہندوؤں کے ایجی ٹیشن میں شریک ہونا۔

(۲) ان کے مخالف ایجی ٹیشن قائم کرنا۔

(۳) سیاسیات ملکی سے بے تعلقی اور اپنی کوششوں کو صرف تعلیم کی جانب مبذول رکھنا

(۴) پولٹیکل مستعدی کا ایک ترمیم شدہ طریقہ اختیار کرنا یعنی ایک طرف نہ تو بالکل خاموش رہنا اور دوسری طرف عام ایجی ٹیشن سے اجتناب۔

ان چاروں میں چوتھے طریقہ کو بہت پسند کیا گیا تھا اور اس طریقہ پر کام کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی تھی کہ مسلمانوں کے سرگروہوں، دانشمند اور مقتدر اشخاص کو انگلستان کی پبلک اور گورنمنٹ ہند کے روبرو اپنے مقاصد کے اظہار کے غرض سے ایک ایسوسی ایشن بالاتفاق قائم کرنی چاہیے اور اس ایسوسی ایشن کو عام ایجی ٹیشنوں سے بالکل علیحدہ رہنا چاہیے اور اسے اپنا استحقاق، اپنی کارروائیوں کی عمدگی، اور قابلیت پر قائم کرنا چاہیے

نہ کہ اپنے شور و غل اور نہ اپنے غیر تعلیم یافتہ حامیوں کے گروہ کثیر پر اور اس ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اپنے حقوق اور اپنی خواہشیں مناسب الفاظ اور خیر خواہانہ طریقوں سے گورنمنٹ کے روبرو پیش کرنی چاہئیں لیکن اس کو چند روزہ زندگی بھی نصیب نہ ہوئی۔ سرسید اور مسٹر بیک کو کالج کی مصروفیتوں سے اتنا موقع ہی نہ ملا کہ وہ اس بڑے کام کی تکمیل کر سکتے اور اس طریقہ کی خوبی اور برائی کی آزمائش بھی ہو جاتی۔

نواب صاحب بدو شعور سے ہی سرکاری سلسلۂ ملازمت میں داخل ہو گئے تھے اور جب اس سلسلہ سے قطع تعلق ہوا تو حیدرآباد میں ذمہ داری کے اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے اس لئے ان کو سیاسیات سے یک گونہ بے تعلقی رہی۔

۱۔ پہلا سیاسی مضمون روسی حملہ ہرات پر ایک مضمون ۱۸۸۵ء میں

البتہ اس زمانہ میں "روسی حملہ ہرات" کا خطرہ بہت قریب تھا، ۱۸۷۶ء کی "جنگ روس و ترکی" کو زیادہ دن نہ گذرے تھے۔ سوڈان میں مہدی کا ظہور ہو چکا تھا انگریز مدبرین کا ایک طبقہ اہلِ ہند اور بالخصوص مسلمانوں اور دیسی ریاستوں سے بدگمان تھا اس موقع پر نواب صاحب نے ایک نہایت معرکۃ الآرا مضمون لکھا، جس میں روسی دعاوی ترقی و تہذیب کی مسلسل خلاف ورزی، ۱۸۷۱ء میں بحر اسود کے شرائط صلح کی پامالی، ۱۸۷۶ء کے حملہ ترکی، سرحد ہندوستان پر پیشقدمی وغیرہ کو بیان کر کے اس کے حملۂ ہندوستان اور قبضہ قسطنطنیہ کے ارادوں وغیرہ کو بیان کیا اور پھر اس پیش قدمی کے اثرات کو ظاہر کر کے اس کو ایک جابر حکومت بتایا۔

اس کے بعد روسی حکومت کے اس خیال کی تردید میں کہ "ہندوستان انگریزی حکومت سے تنگ آ گیا ہے"، کچھ آریوں اور مغلوں کے تاریخی واقعات لکھ کر حکومت انگریزی کے برکاتِ امن و انصاف کا اعتراف کیا۔ پھر اس دعوے کی تردید کی ہے کہ "دیسی ریاستیں غیر مطمئن ہیں اور رعایا بددل ہے"۔ اس کے بعد زمانہ گزشتہ کی حکومتوں کے جبر و ظلم کا انگریزی عدل و انصاف

اور آزادی رائے سے مقابلہ کیا ہے۔

پھر انھوں نے اس سوال پر بحث کی ہے " کہ کیا روس کبھی ہندوستان حاصل بھی کر سکتا ہے اور اس کا جواب سرحد کی فوجی قوت اور ایران و ٹرکی اور انگلستان کی متحدہ طاقتوں کے مقابلہ کے نتائج سے دیا ہے اور اس اثر کو دکھایا ہے جو اس پیش قدمی سے ٹرکی پر پڑے گا اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر ۱۸۷۶ء میں انگریز ترکوں کو کچھ اور مدد دیتے تو روسیوں کو آج ہرات سے اتنے قریب پہنچ جانا نصیب نہ ہوتا۔

پھر اس کو وہ ناقابلِ لحاظ قرار دیکر کہتے ہیں کہ :۔

" اگر انگلینڈ بغیر ٹرکی یا کسی اور قوت کی مدد کے روس کو نہیں روک سکتا ہے تو یہ امید بھی نہیں کی جاسکتی کہ انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں دیرپا ہوگی "۔

آگے چل کر فوجی قوت کے توازن اور تعداد پر بحث کر کے ریاستوں کی افواج کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

" ہماری فوجیں بیکار ہیں کیونکہ نہ ان کے پاس ڈھنگ کے اسلحہ ہیں نہ ان میں عمدہ افسر ہیں نہ وہ اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں آپ خود کیوں نہ اس فوج کو اپنے ہاتھ میں لیں ہر رئیس کے لئے مقرر کر دیں کہ اتنی فوج رکھے۔ اس کو اچھے اسلحہ دیجئے۔ اپنے افسر دیجئے اور شل اپنی فوج کے اس کو تیار کیجئے۔ امن کے زمانہ میں فوج رئیس کے پاس رہے گی لیکن جنگ کے موقع پر ہر رئیس مع اپنے کسی عزیز کے جو فوج کا جنرل ہوگا انگریز کمانڈر انچیف کے حوالہ کر دینے پر بخوشی تیار ہوگا "۔

پھر وہ سوال کرتے ہیں کہ :۔

" کیا آپ کو یہ خوف ہے کہ عمدہ فوج جو اچھے اسلحہ اور اچھے افسر رکھتی ہو اور تربیت یافتہ ہو آپ کے خلاف سر اٹھائے گی ؟ کس لئے سر اٹھائے گی ؟ یقیناً روس کی مدد کے لئے وہ ایسا نہ کرے گی۔ پھر کس لئے ایسا کرے گی کیا سندھیا اور ہلکر یہ چاہیں گے کہ نظام کو متفق ہو کر دہلی کے تخت پر بٹھا دیں یا نظام تنہا اپنی فوج بھیجے گا کہ میسور، ہلکر، یا سندھیا میں سے کوئی ہندوستان کا شہنشاہ ہو جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ان ریاستوں میں سے بعض کو کچھ شکایات ہیں کہ اگر وہ جنگ میں آپ کی شریک ہوگئیں تو آپ ان کی شکایت سننے پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن ان شکایات میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہو سکتی کہ اس کے رفع کرنے کے لئے بندوق کا ایک فیر بھی کیا جائے . . . .

ایک بات میں ضرور عرض کروں گا اور وہ یہ ہے کہ خواہ مخواہ کی افواہوں اور بے بنیاد باتوں پر دھیان نہ دیا جائے۔ اہل غرض کی مخفی خبروں کو مٹانا چاہیئے ہر ہندوستانی دربار میں بدقسمتی سے ایک جماعۃ ایسی ہوتی ہے جس کا کام افواہیں مشہور کرنا اور من گھڑت باتیں بیان کرنا ہوتا ہے وہ اس درجہ نہیں ہوتیں کہ بغاوت پیدا کر دے بلکہ اسی قدر ہوتی ہیں کہ جن کی جگہ ان کو لینا ہوتی ہے ان پر حاوی ہو جائیں ہماری مدد کر دیں اور اپنے مشورہ سے ہم میں وہ اعتماد پیدا کر دیں کہ وفاداری کی لہر ہم میں موج زن ہو جائے اور لارڈ رپن کی یہی پالیسی تھی جس نے تمام ملک میں بے مثال جوش پیدا کر دیا۔"

اخیر میں مہدی سوڈانی کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی ہمدردی کے متعلق جو غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی اس کو دور کیا ہے اور انگریزی حکومت کے احسانات اور ٹرکی کی حمایت کا تذکرہ کر کے امید ظاہر کی ہے کہ :-

"ہم آج کل بھی لارڈ ڈفرن سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس پالیسی کو جاری رکھیں گے۔ وہ ٹرکی اور ترکوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اور "ایلچی" ہونے کے زمانہ سے انھوں نے سب سے زیادہ کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی سلطنتوں میں انگریزوں کے ناموں کا وقار بڑھے بمبئی میں خود انہوں نے اپنی زبان سے اپنے کو ہمارا دوست بیان کیا ہے اور اس کے جواب میں ہم اپنے کو ان کا دوست کہتے ہیں۔

اب تک میں نے باشندگان ہند کی جانب سے بالخصوص بیان کیا ہے اب مجھ کو اس ریاست کی وفاداری کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہیئے جس کی میں خدمت کر رہا ہوں۔ اگر ہندوستان

میں کوئی نازک موقع آیا تو ہم ذمہ لیتے ہیں کہ حیدرآباد ایسا ہی وفادار ثابت ہوگا جیسا کہ وہ ۱۸۵۷ء میں تھا ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ ہم کو وفادار ثابت کرنے کا موقع دیں۔"

مضمون کی عام تعریف اور ویسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کا خط

یہ مضمون ایسی قابلیت سے لکھا گیا تھا کہ پبلک میں ہر طرف سے صدائے تحسین و آفریں بلند ہوئی سرکاری حلقوں میں بھی نہایت پسندیدگی سے دیکھا گیا حتیٰ کہ ویسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری نے گورنمنٹ ہاؤس شملہ سے نواب صاحب کو لکھا کہ :-

"غالباً آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ویسرائے نے آپ کے اس خط کو "مسلمانانِ ہند اور روس کی پیشقدمی" پر ٹائمس اور بمبئی گزٹ کے کالموں میں شائع ہوا ہے نہایت دلچسپی سے مطالعہ کیا ایسے اعلیٰ خیالات جن کی بنیاد واقعات کے صحیح اور مکمل علم پر ہے اور جن کو اس قدر وضاحت اور دلائل کے ساتھ ایک ہندوستانی مسلمان نے بیان کیا ہی بالضرور اس جہالت اور قدیم تعصبات کو جو حکومت اور ہندوستان کے لوگوں کے مابین موجود ہے رفع کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ قابلِ لحاظ بات یہ ہی کہ ایک ہندوستانی مسلمان بے ساختہ ایمانداری کے ساتھ سیاسی حالت پر ایسا مضمون لکھ سکتا ہے جو اگر گمنام ہو تو نہایت تعلیم یافتہ بیدار مغز انگریز کا سمجھا جائے اس مشاہدہ میں جو تعصب سے پاک ہی حکومتِ برطانیہ کی روش اور فیاض پالیسی کو جس کی پالیسی کا مقصد یہ ہی کہ دماغی ترقی اور قومی خوش حالی اور تمام رعایا میں سچی وفاداری کے ساتھ حکومت کو استحکام دے روشنی میں لانے کے لئے اس سے بہتر طریقۂ استدلال نہیں ہو سکتا۔"

۲۔ پبلک سروس کمیشن میں اظہار

نواب صاحب نے فروری ۱۸۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے روبرو بطور شہادت کے ایک تحریری یادداشت پیش کی، لیکن افسوس ہے کہ ہم کو اس کا خلاصہ بھی دستیاب نہیں ہوسکا، اس لئے اس کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا جاسکتا۔

جی ایچ ٹریور صاحب کا ایک خط

البتہ کمیشن کے ایک رکن جی ایچ ٹریور صاحب کا ایک خط جو صاحب موصوف نے کیمپ اجمیر سے لکھا تھا ہم نقل کرتے ہیں جس سے نواب صاحب کی رائے کی عظمت

اہمیت پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ :-

"ان کاغذات کے پہنچنے کا جن میں اُن مسائل پر جو پبلک سروس کمیشن کے روبرو آنے والے ہیں آپ نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے شکریہ قبول کیجیے۔

میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس اظہار میں آپ کی حسب معمول قابلیت اور ہمت شامل ہے اور آپ کے مرتبہ اور تجربہ اور مواقع کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیادہ توجہ پانے کا مستحق ہے مجھ کو آپ کے ساتھ اتفاق ہے کہ موجودہ سول سروس کا داخلہ صرف ولایت میں مقابلہ سے ہونا چاہیے اور عمر کی قید کو کم از کم ۲۱ کر دینا چاہیے مجھ کو یہ خیال ہے کہ اگر اس کو اسپیشل سول سروس کہا جائے تو اس میں چند تقرر مخصوص کر کے جیسا اب تک ہوا ہے باقی کو معمولی سول سروس رکھا جائے اور اس میں وہ بھی شامل ہوں جن کو اب (ان کو ونیٹیڈ سولین) کہا جاتا ہے۔ بعض اعتراضات جو کیے جاتے ہیں ان کا تدارک کیا جا سکتا ہے اور بعض جائز مطالبات پورے ہو سکتے ہیں یہ ممکن ہے کہ اسپیشل سول سروس کو کسی حد تک محدود کر کے معمولی سول سروس کو وسعت دی جائے آخر الذکر کا داخلہ محض مقابلہ پر منحصر نہ ہو کم از کم ہندوستانیوں کے لئے ایسا ہو اور سول سروس کے تقررات کو اسپیشل سول سروس ممنوع نہ ٹھہرائے اور ایسی تبدیلی سے ان ویڈیس (قابلِ نفرت) امتیازات دور ہو جائیں گے جس کے دور کرنے کے آپ موید ہیں۔

ان کو ونیٹیڈ اور اسٹیٹوٹری اصطلاحات پسند نہیں کی جاتیں اور نہ ان کی ضرورت۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ ولایت کے سولین ایس۔ سی ایس (اسپیشل سول سروس) کہلانے پر معترض ہوں گے ان کی تعداد کو بتدریج گھٹانے کی ضرورت ہے تاکہ معمولی سی ایس سول سروس میں اضافہ ہو سکے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے اور حیدرآباد کی اصلاحات رفتہ رفتہ ترقی پذیر ہوں گی۔"

۳۔ نواب صاحب کی پولیٹیکل پالیسی اور کانگرس کی مخالفت

نواب صاحب کے خیالات کانگرس کے متعلق ابتدا

ہی سے اچھے نہ تھے ابتدائی چار سال میں جو کچھ کانگرس کے اجلاسوں میں کارروائی ہوئی تھی اور جو مطالبات اس نے پیش کئے تھے ان کے متعلق اس عرصہ میں سرسید نے جو دو معرکۃ آلارا تقریریں بعنوان "ہماری قوم کو نسبت پولیٹیکل امور سلطنت کے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے" کی تھیں شائع ہو چکی تھیں جن میں کانگرس کے مطالبات اور مسلمانوں کے خاص حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی تھی علاوہ بریں ہندوستان کے اینگلو انڈین پریس میں جو خیالات کانگرس کی نسبت ظاہر کئے گئے تھے اور لارڈ ڈفرن اور گورنمنٹ کے دیگر حکام نے جو رائیں ظاہر کی تھیں ان سب نے نواب صاحب کے خیالات کو اور تقویت دیدی تھی پھر اس وقت تک امپریل اور لوکل سیلف گورنمنٹوں میں مسلمانوں کو داخلہ میں جو ناکامی ہوئی تھی اس کا تجربہ بھی پیش نظر تھا اس لیئے وہ بھی کانگرس کے شدید مخالفین میں تھے۔

اراکین کانگرس کی مدافعت مگر نواب صاحب کے سیاسی عقائد اگرچہ کانگریسی مدبرین اور سیاست دانوں سے بالکل مختلف تھے تاہم وہ ان کا احترام کرتے تھے اور اس کو ایک سیاسی غلطی سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے تھے چنانچہ سرلیپل گریفن کی مشہور تقریر کے جواب میں ۱۸۸۹ء میں جو مضمون انہوں نے انگلستان کے رسالہ "نائنٹینتھ سنچوری" میں لکھا تھا اس میں سرلیپل گریفن کے اس فقرہ کے متعلق کہ "مفسدوں کی سرکوبی میں بے وقوفانہ بزدلی ظاہر کرنے سے انگریزی حکومت کے استقلال کو خطرہ ہے" نواب صاحب نے لکھا تھا کہ "میں اس بات کو نہیں سمجھتا ہوں کہ ان کا اس سے کیا مطلب ہے، میں نہیں خیال کرتا کہ وہ کانگرس پر ایسا سخت الزام لگاتے ہیں میں خود کانگرس کا طرفدار نہیں ہوں اور نہ میں اس کا معتقد ہوں لیکن اس کے اراکین پر بغاوت کا الزام نہیں لگا سکتا البتہ ایک خطرہ کو میں اٹھتا ہوا دیکھتا ہوں اور اس کی اصلیت زیادہ تر یورپ میں ہے وہ یہ ہے کہ مغربی رو سے نکلے ہوئے خیالات مشرقی لوگوں کے دلوں میں جن کو ابھی پوری قابلیت حاصل نہیں ہے سمائے جا رہے ہیں۔ جب بڑے بڑے ماہرین سیاست کو آزادی کا طالب دیکھتے ہیں تو ہم پیچ و تاب کھاتے ہیں اور قدرتی طور پر کسی قدر تعلیم یافتہ، اور تیز ذہن بنگالی کاغذی انتظام بنانے

لگے ہیں ہندوستان اور انگلستان میں جو بہت کچھ غلط فہمیاں ہوتی ہیں اُن کی وجہ اس مسئلہ پر غور کرنے پر معلوم ہو جاویگی آپ لوگ صدیوں کی آزادی کے ساتھ جو آپ کو مختلف جھگڑوں اور نقصان کے بعد حاصل ہوئی ہی ہم لوگوں کی جانچ اپنے معیار سے کرتے ہیں۔ اور ہم لوگ جنہوں نے صرف آزادی کے معنی سمجھنا شروع کئے ہیں فوراً اس آزادی کے تمام حقوق کو بغیر پہلے تعلیم پانے کے چاہنے لگتے ہیں۔ یہ غیر ممکن بات ہی کہ صرف اسّی سال کے امن و اماں کے زمانہ کی بُری عادتوں اور زمانہ حال کے اور جو ملک دکن اور جنوبی ہندوستان میں رہا ہی لوگ پچھلی باتوں یا عادتوں کو بھول جائیں جو صدیوں کے بدانتظامی کے نتیجہ سے پیدا ہوئی ہی۔ پچھلے زمانہ کی بُری عادتوں اور زمانہ حال کے پولٹیکل خیالات کے درمیان ٹھیک اوسط قائم رکھنا اور اس پر چلنا ایک نہایت مشکل بات ہے۔

نواب صاحب جب وظیفہ لیکر حیدر آباد سے برٹش انڈیا میں آئے تو اس وقت اگرچہ محمدن اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن زندہ تھی اور ۷۔ دسمبر ۱۸۹۴ء کے اجلاس میں انہوں نے شرکت بھی کی لیکن سیاسی جدوجہد کے مقابلہ میں انہوں نے تعلیمی بیداری کی کوششوں کو زیادہ مفید اور ضروری سمجھا اور معاملات کالج کی اصلاح، اور اس کے استحکام و ترقی میں مصروف ہوگئے اور اپنے حقوق کا محافظ خود حکومتِ برطانیہ ہی کو سمجھتے رہے۔

اردو ہندی کا جھگڑا لوکل گورنمنٹ کا رزولیوشن

لیکن حالات میں تغیر ہو رہا تھا۔ زمانہ انقلاب پذیر تھا اور سیاسی رو سے بچنا ناممکن تھا صوبہ متحدہ کی حکومت سر انٹونی میکڈانل کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کی گورنمنٹ نے ۱۸۔ اپریل ۱۹۰۰ء کو سرکاری دفاتر میں ناگری حروف جاری کئے جانے کا رزولیوشن صادر کیا جس نے مسلمانوں میں سخت بے چینی پیدا کر دی کیونکہ مسلمانوں کے لئے من حیث القوم

(۱) **ہندوؤں کی کوششیں** ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض باثر ہندوؤں کو یہ خیال ہوا کہ سرکاری دفاتر میں بجائے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے بھاشا اور دیوناگری حروف جاری کئے جائیں اس غرض کے لئے تنظیمی کوششیں شروع ہوگئیں انجمنیں اور سبھائیں قائم ہوئیں، سرمایہ فراہم کیا گیا، یہی زمانہ تھا کہ صوبہ بہار میں بھی اردو کے خلاف معرکہ آرائی تھی۔ لفٹنٹ گورنر بنگال نے باوجود مسلمانوں اور انصاف پسند ہندوؤں کے احتجاج کے بہاری زبان اور کیتھی حروف بجائے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے جاری کر دئے۔ سر انٹونی اس وقت اس ضلع میں کلکٹر و مجسٹریٹ تھے اور اس تبدیلی کے بڑے معاون اور حامی تھے۔ ممالک متحدہ میں سرسید نے (باقی نوٹ بر صفحہ آئندہ)

یہ رزولیوشن سخت مضر تھا۔ تعلیم اور وسیع و ترقی پذیر لٹریچر عدالتی و تجارتی اور تمدنی کاروبار ہندو مسلم اتحاد، غرض سب ہی اس کی زد میں تھے اور دوسرے فریق کے لئے بھی کچھ زیادہ مفید نہ تھا

علی گڑھ میں ایک احتجاجی جلسہ

یوں تو ہر جگہ مسلمانوں میں بے چینی تھی لیکن چونکہ اس وقت تک علی گڑھ ہی تمام سیاسی، تمدنی، اور تعلیمی تحریکات کا مرکز تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر وہ ہی زیادہ متاثر ہوا۔ ۲۔مئی ۱۹۰۰ء کو نواب صاحب کی کوٹھی پر ایک مختصر جلسہ رؤسا، و امرا اور تعلیم یافتہ اصحاب کا منعقد ہوا۔ اور نواب صاحب کے ساتھ نواب لطف علی خاں نے یہ تجویز کی کہ علی گڑھ اور دیگر اضلاع کے مسلمانوں کی ایک ابتدائی میٹنگ کی جائے تاکہ گورنمنٹ کے اس رزولیوشن پر غور کرے چنانچہ ۱۳۔مئی کو ایک عظیم الشان جلسہ علی گڑھ کے کراسٹھویٹ[1] ہال میں نواب لطف علی خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔

نواب محسن الملک کی تقریر

نواب محسن الملک نے ایک پُرزور اور پُرجوش تقریر کی جس کی تمہید میں حاضرین کو اعتدال صبر و تحمل اور ادب و احترام کو ملحوظ رکھکر کارروائی کرنے کی ہدایت کی اور اس امر کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ گورنمنٹ کی نیک نیتی اور منصفانہ خیال کو پیش نظر رکھیں اور اسی کو کسی فریق کی حمایت یا ایک کے حقوق کو دوسرے کے حقوق پر ترجیح دینے کے خیال

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) تنہا اس حملہ کا مقابلہ کیا اور ہندؤں کی تجویز اس بنا پر نامنظور ہوئی کہ فارسی رسم الخط اور اردو زبان کی اشاعت بہ نسبت ناگری اور بھاشا کے بہت زیادہ ہے لیکن ہندو مایوس نہ ہوئے ان کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ اور پنجاب کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا دونوں صوبوں کے ہندؤں نے ۱۸۸۲ء میں پھر ایک متحدہ کوشش کی اور ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اپنے دعاوی صدہا محضروں کی صورت میں پیش کئے۔ کمیشن نے اس مسئلہ پر خاموشی اختیار کی تاہم ہندؤں کی کوششوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور جب ۱۸۹۵ء میں صوبہ ممالک متحدہ میں سر انٹونی میکڈانل لفٹنٹ گورنری پر آئے تو پھر ایک زبردست میموریل پیش ہوا سر سید نے مخالفت میں آواز بلند کی اور اپنے انتقال سے ۹ دن پہلے یعنی ۱۹۔مارچ کو ایک زبردست مضمون شائع کیا اور ہندؤں کو بظاہر ایک مرتبہ ناکامی ہوئی لیکن آخر کار ۱۹۰۰ء میں پھر وہ کامیاب ہو گئے۔

[1] سر چارلس کراسٹھویٹ لفٹنٹ گورنر کی یادگار میں ایک پبلک عمارت امرا و اعیان علی گڑھ نے بنائی ہے۔

سے پاک و آزاد سمجھیں نیز اپنے ہم وطن ہندو بھائیوں کے اغراض و فوائد کے برخلاف حملہ آوری سے بچیں۔

اس نصیحت آمیز تمہید کے بعد اُنہوں نے اصل رزولیوشن پر نہایت مدلّل بحث کی اور اس کے مضر پہلوؤں کی نہایت واضح تشریح کی۔ اور مسلمانوں کو غیرت دلائی کہ وہ ان کوششوں کے دوران میں غافل بیٹھے رہے اور صرف ایک مقام پر کچھ کوشش ہوئی تو دولتمند اور ذی اثر مسلمانوں نے ان کی مدد نہ کی۔ اور مشورہ دیا کہ تمام شمالی ہندوستان کے مسلمانوں سے صلاح و مشورہ کر کے گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لئے میموریل تیار کیا جائے اور اس میں وہ تمام نقصانات جو اس رزولیوشن کا قطعی نتیجہ ہیں آزادی کے ساتھ مگر مؤدبانہ طریقہ سے ظاہر کئے جائیں برٹش گورنمنٹ اور ہنر آنر سر انٹونی میکڈانل کی انصاف پسندی و حق پسندی کا یقین دلایا اور اس رزولیوشن کو نیک نیتی کی غلطی پر محمول کیا اور آخر میں کہا:۔

"میں نہیں کہتا نہ کہہ سکتا ہوں کہ جو کوشش کی جائے گی اس میں پوری پوری کامیابی ہوگی یا ہمارے خیالات سے گورنمنٹ کے خیالات ہر بات میں متفق ہوں گے کیونکہ ممکن ہے کہ بوجہ اس کے کہ اس معاملہ میں ہمارے اغراض شامل ہیں رائے قائم کرنے میں ہم سے خطا ہو" یا بعض دلائل ہمارے ضعیف ہوں مگر اس مقولہ کو ہمیشہ یاد رکھو کہ " رعایا کی خواہشوں کا سننا کام ہے ایک دانا گورنمنٹ کا اور ظاہر کرنا اپنی خواہشوں کا اور مانگنا اپنے حقوق کا کام ہے ایک آزاد اور وفادار رعیت کا"۔ اور اپنے اس پاک عقیدہ کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ ہمارا کام ہی کوشش کرنا اور خدا کا کام ہی اس کا پورا کرنا" پس ہم سب کو چاہئے کہ اس قومی کام کو دانشمندی اور استقلال سے کریں اور بذریعہ ایک معزز ڈپوٹیشن کے ایک میموریل ہنر آنر سر انٹونی میکڈانل ہی کے حضور میں پیش کریں اگر ہم کامیاب ہوئے فہو المراد اگر ناکام رہے تو ہمارا دل اس خیال سے مطمئن رہے گا کہ ہم نے اپنا حق ادا کیا اور آیندہ آنے والی نسلیں اس بات کو دیکھ کر ہماری شکر گزار ہوں گی کہ ہم نے ان کی بہبودی کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا

پس اے مسلمانو آؤ اور خدا کے کرم اور گورنمنٹ کے انصاف پر بھروسہ کر کے اس قومی کام میں بلا خیال اس کے کہ تم جیتو گے یا ہارو گے آخری کوشش کر لو تاکہ کہنے کو یہ بات رہ جائے کہ ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہی وے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اہم رزولیوشن اس کے بعد نواب صاحب نے ہی میموریل تیار کر کے پیش کئے جانے کا رزولیوشن پیش کیا اور باتفاق پاس ہوا اسی طرح متعدد ضروری رزولیوشن پاس ہوئے۔

ایک رزولیوشن کے ذریعہ سے یہ کام نواب محسن الملک کے سپرد ہوا کہ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک پبلک ریپریزنٹیٹو میٹنگ کے انعقاد کا انتظام کریں تاکہ اس میں گورنمنٹ کے رزولیوشن پر بحث ہو کر ایک متفقہ عرضداشت تیار کی جائے۔

نواب صاحب کی تحریک سے ایک رزولیوشن یہ بھی پاس ہوا کہ :-

"دربارہ اس نکتہ چینی کے جو گورنمنٹ رزولیوشن زیر بحث کے متعلق ہو کوئی مباحثہ یا استدلال یا بیان جائز نہ رکھا جائے جس سے سلطنت برطانیہ کی طرف سے بے دلی پیدا ہو یا اس کے بے لوث اور فیاضانہ مقاصد اور ارادوں کی نسبت شک و شبہ کی بو آتی ہو"

ساتھ ہی یہ رزولیوشن بھی پاس ہوا کہ میموریل میں اس بات کا بھی خاص لحاظ رکھا جائے کہ ملکہ معظمہ کی ہندو رعایا کے خاص فوائد و اغراض کے برخلاف کسی قسم کی حملہ آوری نہ ہو اور نیز کوئی خصومت انگیز مباحثے جس سے قومی یا مذہبی جھگڑے مابین ہندو و مسلمان رعایائے ملکہ معظمہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو جائز نہ رکھے جائیں"

اس کل کارروائی کی نقل بھی گورنمنٹ میں بھیج دی گئی۔

ہز آنر کی برہمی اور پالیسی کی توضیح بمقام لکھنؤ ایک زبردست جلسہ کا انعقاد قرار پایا لیکن قبل اس کے کہ یہ جلسہ منعقد ہو ہز آنر نے علی گڑھ کے جلسہ کی کارروائی اور اسلامی پریس کے احتجاج

کو اپنی گورنمنٹ کی پالیسی پر ایک حملہ سمجھا اور اس لئے ان کا مزاج برہم ہوگیا اور انہوں نے بنارس کے عام جلسہ میں ضروری سمجھا کہ اپنے آپ کو اس اتہام سے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی بیجا رعایت کرتے ہیں پاک ثابت کریں۔

لرزہ براندام اشخاص

ہز آنر کی برہمیٔ مزاج نے بہت سے پُرجوش لوگوں کو مرعوب کر دیا اور اس احتجاج کے متعلق بعض حلقوں سے یہ آواز بلند ہوئی کہ اُس پالیسی سے انحراف کیا جا رہا ہے جس کو نہایت سوچ سمجھ کر اور مضبوطی کے ساتھ اختیار کیا گیا تھا اور جس پر مدت دراز سے مسلمان عمل کر رہے تھے۔

ان مرعوب شدہ اشخاص میں علی گڑھ والے جلسہ کے پریسیڈنٹ نواب لطف علی خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے ہز آنر سے کہا تھا کہ "چونکہ ان کو واقعات غلط بتائے گئے تھے اس لئے انہوں نے پریسیڈنٹی منظور کی تھی مگر جب ان کو اصل واقعات معلوم ہوگئے تو انہوں نے استعفا دیدیا اور اپنا تعلق ہر قسم کا کمیٹی سے الگ کرلیا"

لکھنؤ کا مشہور جلسہ

حسب رزولیوشن جلسہ منعقدہ علی گڑھ ۱۸۔ اگست ۱۹۰۰ء کو سنٹرل اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کا جو اسی سلسلہ میں قائم کی گئی تھی نواب صاحب کی صدارت میں بمقام لکھنؤ ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں زیادہ تر حصہ جدید تعلیم یافتہ گروہ اور خاصکر قانون پیشہ اصحاب نے لیا تاہم پبلک کی نیابت بہت زبردست تھی اور مجمع نہایت شاندار تھا منجملہ دیگر رزولیوشنوں کے جو مختلف اصحاب نے پیش کئے

نواب صاحب کا رزولیوشن اور تقریر

نواب صاحب نے بھی حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا:-

"اس مجمع کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ سر انٹونی میکڈانل صاحب بہادر نے رزولیوشن مورخہ ۸- اپریل ۱۹۰۰ء دربارہ نفاذ ناگری عمداً کسی فریق کی طرفداری یا کسی نامنصفانہ کارروائی سے دانستہ اہلِ اسلام کو ضرر پہنچانے کی نیت سے پاس کیا ہے، بلکہ جیسا کہ صاحبِ ممدوح کے بیان سے ظاہر ہوگا ان کا یہ رزولیوشن صرف کثرتِ اہالیان ممالک مغربی وشمالی واودھ کے

فائدہ کی غرض پر مبنی ہے گو یہ جلسہ ہز آنر کی رائے سے متفق نہیں ہو سکتا"

اس رزولیوشن کی تحریک میں نواب صاحب نے ایک زبردست تقریر کی جس میں انہوں نے قدیم پالیسی سے انحراف کے اعتراض کا مدلّل جواب دیا اور موجودہ طرز کارروائی کو "خاص تکلیف کا مؤدبانہ اظہار" قرار دیا اور ۱۸۷۳ء میں اس خاص معاملہ کے متعلق سرسید نے جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کو بھی اسی سے منطبق کیا۔ پھر انہوں نے اس بات کی تردید کی کہ گورنمنٹ نے کسی فریق کی طرفداری یا بیجا ارادہ سے اس حکم کو جاری کیا ہے اور ہدایت کی کہ جو اعتراض و نکتہ چینی کی جائے اس میں "گورنمنٹ کی نیک نیتی اور منصفانہ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے" اور یہ کہ ہز آنر سر انٹونی میکڈانل کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ ان کی نسبت طرفداری یا ناانصافی کا خیال کیا جائے" پھر گورنمنٹ انگریزی کے انصاف کی مدح سرائی کر کے مسلمانوں کی جاں نثارانہ وفاداری اور تحفظ زبان کے تیقن کا اس طرح اظہار کیا کہ:۔

"گو ہمارے ہاتھ میں قلم نہیں اور ہمارے قلم میں زور نہیں اور اسی وجہ سے ہم دفتروں میں کم نظر آتے ہیں مگر ہمارے ہاتھ میں تلوار پکڑنے کی قوت ابھی باقی ہے (چیرز) اور ہمارے دلوں میں ملکہ معظمہ کی محبت ہے (چیرز) اور ان کی گورنمنٹ کی برکتوں پر ہم کو یقین ہے اور اسی گورنمنٹ کی بدولت ہم اپنی سلطنت کے جانے کے بعد اپنا وجود ہندوستان میں دیکھتے ہیں اور آزادی اور امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہیں پس گو قلم سے کچھ نہیں کر سکتے مگر خدانخواستہ جب مغرب سے ہم کسی کو اس گورنمنٹ کے مقابلہ میں آتے دیکھیں گے تو اسی طرح ملکہ معظمہ کے تاج اور سلطنت پر اپنا خون بہائیں گے جیسا اپنے ہم مذہب بادشاہوں کی بادشاہی قائم رکھنے کے لئے بہاتے تھے (نہایت جوش کے ساتھ چیرز) ہم اپنی قوت کو گورنمنٹ کے دشمنوں پر کام میں لاویں گے ہم کبھی ایک لحظہ کے لئے بھی خیال نہیں کر سکتے کہ گورنمنٹ ہم کو بھلا دے اور چھوڑ دے اور ہماری ان چیزوں کو جن پر ہماری زندگی ہے صدمہ پہنچنے دے مجھے ہرگز یقین نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہماری زبان کو مرنے دے گی، بلکہ اس کو زندہ رکھے گی اور وہ

کبھی مرنے نہ پائے گی مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو کوشش اس کے مارنے کی دوسری طرف سے ہو رہی ہے اگر وہ برابر جاری رہی تو آیندہ کسی وقت ہماری زبان کو صدمہ پہنچے گا یہی خوف ہے جس کے لئے یہ کوششیں ہو رہی ہیں تاکہ ہم اپنی زبان کو زندہ رکھ سکیں اور اگر خدانخواستہ وہ وقت آوے کہ اس کو زندہ نہ رکھ سکیں تو اس کا جنازہ تو دھوم سے نکالیں ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے“

اس کے بعد ملازمتوں وغیرہ کے تناسب کا ذکر تھا[1] اور ہنر آنر نے ملازمتوں کا جو تناسب قرار دے رکھا تھا اس پر مؤدبانہ نکتہ چینی تھی اور ساتھ ہی اس خاص امداد کا جو ہز آنر نے کالج کو دی اور معاملات میں دلچسپی و ہمدردی سے کام لیا اس کا نہایت پُرجوش الفاظ میں شکریہ تھا پھر انہوں نے اس خط وکتابت کو سنا کر جو ان جلسوں کے متعلق نواب لطف علی خاں سے ہوئی تھی ان کے استعفے اور غلط بیانی کا پردہ فاش کیا اور کہا کہ :-

”صاحبو! جب کسی مسئلہ کی نسبت تمام قوم کے دل کو صدمہ پہنچے تو اس کے متعلق ایجی ٹیشن کے پھیلانے اور برانگیختہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ایسے وقت میں ہمارا فرض حقیقت میں یہ ہے کہ پبلک کی رائے کو اعتدال پر لائیں اور گورنمنٹ کے ارادوں اور مقاصد کی نسبت جھوٹے خیالات لوگوں کے دلوں سے دور کریں باوجود اس کے کہ ایسے بڑے شخص جیسے کہ ہمارے مستعفی پریسیڈنٹ ہیں اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے یا بڑے بڑے نواب اور رئیس خیالی خوف سے علیحدہ رہے ہم کو یقین ہے کہ ہماری قومی زبان مرنے نہ پاوے گی اور ہمیشہ زندہ رہے گی[2]

[1] سر آکلینڈ کالون کی نسبت ہندوؤں کو شکایت تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو زیادہ جگہیں دیکر ان کی حق تلفی کی اور مسلمانوں کو سر انٹونی کے متعلق شکایت تھی کہ وہ مسلمانوں کو کم جگہ دیتے ہیں اور اس کے متعلق اخبارات میں بحثیں وغیرہ ہوتی رہتی ہیں۔

[2] جس وقت نواب محسن الملک بہادر لیکچر دے رہے تھے اور پریسیڈنٹ کے استعفے پر بحث کر رہے تھے اتفاق سے نواب وقار الملک بہادر نے سوال کیا کہ آیا آئندہ آپ کو تو کوئی مصلحت مستعفی ہونے پر مجبور نہ کرے گی نواب محسن الملک نے اس کا جواب دیا کہ جب موقع آویگا دیکھا جاویگا عجیب اتفاق ہے کہ نواب محسن الملک بہادر نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن سے استعفیٰ دیا۔

پھرانہوں نے گورنمنٹ رزولیوشن کے اثرات اور عدالتوں میں استغاثہ اور درخواستوں وغیرہ کے متعلق جو دقتیں پیش آرہی تھیں ان کو بالتصریح بیان کرکے آخر میں کہا کہ:۔

"صاحبو! حاصل کلام یہ ہے کہ اگر اس رزولیوشن کے اصلی معنی اُس حد تک محدود رہیں جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تو ہم کو اس سے کوئی اختلاف نہیں کیونکہ اس سے اردو زبان وحروف کی عدالتوں کی مسلّمہ زبان اور حروف ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اصل مقصد اس کا یہی ہوگا کہ خاص خاص صورتوں میں ان غریب لوگوں کے لئے آسانی اور سہولت ہو جو صرف ناگری جانتے ہیں اور اپنے وکیل آپ ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہز آنر کا بھی اصل منشا یہی ہے اور ہمارے اختلاف پر جو اس رزولیوشن کے متعلق ہے اسی خیال سے ہز آنر کو تعجب بلکہ بڑا تاسف ہے کہ ہم ایسے حکم پر جس سے ہماری زبان کو کچھ ضرر نہیں پہنچتا اور جس سے دوسرے مستفید اور متمتع ہو سکتے ہیں مخالفت کرتے ہیں اگر اس کی تشریح کردی جائے اور وہ ابہام جو پیدا ہو گیا ہے رفع کر دیا جائے تو اس بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کسی قسم کا اعتراض باقی نہیں رہتا"

نواب صاحب کی یہ تقریر ان معرکۃ الآرا تقریروں میں سے ہے جو اگرچہ وقت اور موقع کے لحاظ سے ہوتی ہیں لیکن لٹریچر میں ہمیشہ کے لئے وہ جگہ حاصل کر لیتی ہیں[1]۔

۱۔ پولیٹیکل ایسوسی ایشن کی تحریک اگرچہ لکھنؤ میں نہایت پُرجوش جلسہ ہوا تھا اور امید تھی کہ اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن نہایت استحکام و استقلال کے ساتھ اپنے مقاصد کو انجام دے گی لیکن جس طرح کہ علی العموم مسلمانوں کی قومی انجمنیں عالم شیر خواری ہی میں آغوشِ فنا میں سو جاتی ہیں یہ ایسوسی ایشن

---

[1] **البشیر کے مضامین** اردو و ہندی کے مسئلہ پر اس زمانہ میں صوبۂ متحدہ وغیرہ کے تمام مسلمان اخبارات نے پُرزور مضامین لکھے لیکن خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین اڈیٹر اخبار البشیر اٹاوہ نے سب سے زیادہ حصہ لیا اور ایک عرصہ تک سلسلۂ مضامین جاری رکھا اور یہ مضامین اس لائق ہیں کہ ان کو ایک کتاب کی صورت میں محفوظ کیا جائے کیونکہ ادب اُردو کی یہ ایک بہترین تاریخ ہے۔

بھی چند سال زندہ رہ کر فنا ہو گئی۔[۱۵]

تاہم اس چند روزہ جوش وخروش نے مسلمانانِ ہند میں اپنی پولیٹیکل حالت کا احساس پیدا کر دیا اور یقین دلا دیا کہ اپنے قومی حقوق کے لئے صرف گورنمنٹ کا ہی اعتماد اور بھروسہ کافی نہیں۔

قوم کے سامنے حقوق سیاسی کی حفاظت کا سوال

نواب محسن الملک نے اگست ۱۹۰۱ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں محمڈن اینگلو اورنیٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا کی روداد ۱۸۹۳ء شائع کی اور قوم کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ:-

"مسلمانوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟"

اور پھر خود ہی اس سوال پر بحث کی جس کا خلاصہ یہی ہو سکتا ہے کہ:-

"کوئی نہ کوئی تجویز جو مسلمانوں کے لئے مفید اور جس سے ان کے حقوق کی حفاظت ہو سکے اختیار کی جائے مگر وہ ایسی ہو جس کا نتیجہ خودکشی نہ ہو۔ یعنی جس سے مسلمان پبلک ایجی ٹیشن

۱۵؎ اردو ڈیفنس درحقیقت بند ہوئی اس وجہ سے کہ مسٹر انٹونی میکڈانل بہ حیثیت پیٹرن محمڈن کالج کے علی گڑھ آئے اور انہوں نے ٹرسٹیوں کو جمع کرکے اس ایجی ٹیشن پر جو اردو ڈیفنس کے ذریعہ سے کی جاتی تھی اپنی سخت ناراضی کا اظہار کیا اور یہ الزام لگایا کہ کالج سے طلبہ ایجی ٹیشن کرنے کے لئے بھیجے گئے کالج کے اساتذہ اور بعض ٹرسٹیوں نے اور نواب محسن الملک سکرٹیری نے اس میں نمایاں حصہ لیا اگر یہ طریقہ جاری رہا تو گورنمنٹ سے جو امداد کالج کو ملتی ہے وہ بند کر دی جائے گی بعض ٹرسٹیوں نے سر انٹونی کی خوشامدانہ تائید کی اور تمام تر الزام نواب محسن الملک پر لگایا نواب محسن الملک کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو وہ سکرٹیری شپ سے استعفا دیں یا اردو ڈیفنس کی پریسیڈنٹی سے چنانچہ انہوں نے اردو ڈیفنس کی پریسیڈنٹی سے استعفا دیدیا اس پر قومی اخبارات میں ان کے خلاف سخت نکتہ چینی کی گئی غرضکہ سر انٹونی میکڈانل نے پوری قوت سے کام لیا کہ اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن بند ہو۔ بیرسٹروں اور وکلا میں بھی زیادہ حصہ ٹرسٹیان کالج کا تھا وہ اس خوف سے کہ سر انٹونی کالج کی امداد بند کر دیں خاموش ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن بند ہو گئی تاہم سر انٹونی کی مخالفت زبانِ اردو اور نیز مسلمانوں کو ملازمت نہ دینے کی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور اسی وقت پولیٹیکل ایسوسی ایشن قائم کرنے کی بحث قومی اخبارات میں شروع ہو گئی جس کا نتیجہ مسلم لیگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ (نوٹ مولوی بشیر الدین صاحب)

میں شریک نہ ہوں اور نہ اپنے قومی مقاصد کی حفاظت پبلک ایجی ٹیشن پر منحصر کر دیں اور بجائے اس کے گورنمنٹ کی ہمدردی اور مہربانی کو اپنی قوم کے لئے سب سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ ضروری سمجھیں اور کسی قسم کی غلط کارروائی سے گورنمنٹ کو اپنی طرف سے بدگمان کر دیں۔

سرسید مرحوم نے چالیس برس کی محنت کے بعد جو بدگمانیاں مسلمانوں کی طرف سے تھیں ان کو گورنمنٹ اور حکام اور انگریزوں کے دلوں سے دور کیا تھا ایسا نہ ہو کہ اس مدبر اور دور اندیش اسٹیٹسمین کی ساری عمر کی کارروائی ہم لوگوں کے جوش اور غصہ کے نذر ہو جائے اور بجائے فائدے کے ہماری قوم کو نقصان اٹھانا پڑے۔"

پھر انہوں نے کسی ایسی جماعت کے نمونے سے جو پولٹیکل حقوق کی حفاظت کرے نقصانات کا تذکرہ کر کے محمدن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن کے زندہ کئے جانے پر زور دیا اور اس کا اساسی اصول یہ بتایا کہ "جو لوگ اہل و قابل ہوں وہ اس میں شریک ہوں گورنمنٹ میں مؤدبانہ اور خیر خواہانہ طریقہ پر اپنے حقوق کے متعلق میمورینڈم پیش کئے جائیں اور اس بات کی کافی احتیاط کی جائے کہ پولٹیکل ایجی ٹیشن کا ضرر رساں اثر نہ پہنچنے پائے"۔ غرض انہوں نے متعدد مضامین شائع کئے اور مشورہ دیا کہ "مسلمان اپنے پولٹیکل حقوق کی حفاظت کے لئے مستعد ہو جائیں۔ لیکن اس مستعدی کو مذکورہ بالا اصول پر ہی مشروط کیا پھر ایک پولٹیکل ایسوسی ایشن قائم ہوئی لیکن نواب صاحب کا تعلق صرف ممبری تک محدود رہا۔

بعض اہم سیاسی مسائل

اگرچہ نواب صاحب کی بہترین قوتیں کالج کی ترقی اور اس کو یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچانے اور قوم میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت پر مشغول رہیں لیکن اہم مسائل سیاسی سے بھی انہوں نے قطع نظر نہیں کی اور وقتاً فوقتاً انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے کالموں میں اور پبلک تقریروں میں اپنے خیالات ظاہر کرتے رہے۔

ہندو مسلمانوں کا اتحاد

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا مسئلہ اُن مسائل مہمہ سے ہے جن پر ہندوستان کی

حقیقی ترقی اور ملک کے امن و امان کا انحصار ہے۔

ہندوستان کے شہر و قصبات حتیٰ کہ دیہات تک میں ہندو مسلمانوں کی آبادی اس امر کی کافی شہادت ہے کہ یہ دونوں قومیں ہمیشہ سے اتحاد اور اشتراک عمل کے ساتھ رہتی تھیں اور بکثرت ایسی مثالیں موجود تھیں کہ ہندو مسلم خاندانوں کی دوستی درجہ قرابت تک پہنچ گئی تھی جس کے آثار ابھی تک بعض بعض جگہ موجود ہیں لیکن بدقسمتی سے جدید تعلیم سیاسی اغراض و مقاصد اور آریہ تحریک نے اس اتحاد پر کاری ضرب لگادی اور ایک قوم دوسری قوم کو مشتبہ نظروں سے ہی نہیں دیکھنے لگی بلکہ صاف طور پر دشمنی کا اظہار ہونے لگا تاہم پرانے لوگوں اور پرانے شریف خاندانوں میں عرصہ تک وہ آثار دوستی بھی باقی رہی۔

ہندوؤں سے دوستانہ تعلقات

نواب محسن الملک نے اپنے وطن اور خاندان میں ان ہی شریف روایات کو دیکھا تھا اور خود بھی ان روایات کو قائم رکھا جب وہ حیدرآباد میں اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے تو وہاں جس طرح انہوں نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا اسی طرح ہندوؤں کو بھی اور تمام قوموں کا ان پر اعتماد رہا۔

جب وہ وظیفہ یاب ہو کر حیدرآباد سے واپس آئے اور کالج کے سکرٹیری ہوئے تو بھی ہندوؤں سے وہی تعلقات قائم رہے لیکن اردو ہندی کے جھگڑے میں، اور نیز اس سیاسی پالسی کے سبب سے جو سرسید نے قائم کی تھی اور جس کی نواب صاحب نے قومی تحفظ کے خیال سے حمایت و حفاظت کی ہندوؤں سے اختلاف ہونا یقینی تھا اور ہوا لیکن وہ محض اختلاف ہی تھا، مخالفت نہ تھی۔ اگرچہ ہز آنر سر انٹونی میکڈانل نے اپنی ایک تقریر میں جو ۱۱۔ نومبر ۱۹۰۱ء کو ٹرسٹیان کالج کے ایڈریس کے جواب میں کی تھی ایک ایسا اشارہ کر دیا تھا جس سے تنگ خیال ہنود کو نواب صاحب اور ٹرسٹیان کالج کے خلاف رائے قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا لیکن نواب صاحب کی زندگی میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملے گی جس سے ان کے تعصب یا منافرت کا شمہ برابر بھی اظہار ہوتا ہو۔ ہندو مسلم اتحاد کے متعلق ان کے جو خیالات تھے ان کو اپنی پالسی کی تشریح کے ساتھ نہایت

آزادی کے ساتھ صاف طور پر ہمیشہ ظاہر کیا۔

ایک آرٹیکل — چنانچہ ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے کالموں میں ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

"ہمارے[1] معزز دوست نے ہماری نسبت اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہم ہندو اور مسلمانوں کے دوستانہ خیالات میں فرق پیدا کرنا نہیں چاہتے حقیقت میں یہ سچ اور بالکل سچ ہے انسان اپنا دل چیر کر نہیں دکھا سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ہم دکھا دیتے کہ ہمارے دل میں یہ شوق اور یہ تمنّا کہ ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد اور ارتباط رہے کس قدر ہے اور ہم ہندوستان کی ترقی اور بہبودی کے لئے اس کو کہاں تک ضروری سمجھتے ہیں۔ اور جیسا کہ ہمارے معزز دوست نے لکھا ہے خود میرا برتاؤ اپنے دوسرے ہموطن بھائیوں کے ساتھ اس کا شاہد ہے۔

مجھے اس پر فخر ہے اور ہمیشہ میرے دل کو تسلی اور خوشی اس بات کے خیال سے ہوتی ہے کہ میرے معزز اور مہربان دوست پارسی اور ہندو اور مرہٹہ حضرات ہیں جن سے مجھے خلوص اور موانست مسلمانوں سے کچھ کم نہیں اور میرے ساتھ ان کا دوستانہ برتاؤ ایسا ہے کہ خود میرے ہم مشرب اور ہم مذہب بھائیوں کا اس سے زیادہ نہ ہوگا باایں ہمہ اگر ہم بعض پولیٹیکل مسائل میں اپنے ہموطن بھائیوں سے متفق نہیں ہیں اس سے کسی کا یہ سمجھنا کہ ہم باہمی اتحاد وارتباط کے مخالف ہیں صحیح نہیں ہے البتہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم مسلمان ہیں اور اپنے بھائی مسلمانوں کے حالات اور خیالات سے خوب واقف ہیں اور ان کے لئے جو باتیں مفید اور مضر ہیں ان کو خوب جانتے ہیں اور جیسا کہ مقتضائے فطرت انسانی ہے ہم اپنی قوم کی پست حالت پر ہمیشہ غمگین رہتے ہیں اور ان میں مثل دیگر قوموں کے علم، دولت اور عزت کی ترقی چاہتے ہیں اور ان افعال واعمال سے ان کو بچانے کی فکر کرتے ہیں جن سے ان کو

---

[1] منشی گنگا پرشاد ورما اڈیٹر ہندوستانی وایڈوکیٹ لکھنؤ کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے نواب صاحب کے ایک مضمون کے متعلق نیشنل کانگریس پر تبصرہ کرتے ہوئے نواب صاحب کے اس عمدہ برتاؤ کا جو ہندوؤں کے ساتھ تھا اعتراف کیا تھا۔

نقصان اور ضرر پہنچنے کا احتمال ہی بلا شک ہماری یہ رائے ہے اور ہم اس پر اب تک بہت استقلال و استحکام کے ساتھ قائم ہیں کہ نیشنل کانگرس مسلمانوں کے لئے مفید ہی ہماری یہ رائے صحیح ہی یا غلط جس کو اس سے اختلاف ہو وہ ہماری رائے کی نسبت جو چاہے کہے مگر ہم کو محض اختلاف رائے کی وجہ اور بنا پر اپنا مخالف نہیں کہہ سکتا۔

اختلاف رائے اور چیز ہی اور مخالفت اور شے ہے"۔

مسٹر گوکھلے کی کالج وزٹ

اسی طرح فروری ۱۹۰۶ء میں جبکہ آنرایبل مسٹر گوکھلے علی گڑھ آئے اور انھوں نے "لائل لائبریری" میں "ہندو مسلمان" کے عنوان پر لیکچر دیا اور اسٹریچی ہال میں طلبا کے سامنے تقریر کی تھی تو ان کے لیکچر ختم ہونے کے بعد اس موقع پر بھی نواب محسن الملک نے مختصر لفظوں میں اپنے خیالات کا اعادہ کیا تھا۔

لکھنؤ میں مسٹر گوکھلے کے جام صحت کی تائید میں ایک اہم تقریر

اس کے بعد لکھنؤ میں ایک دعوت کے موقع پر مسٹر گوکھلے کے جام صحت کی تجویز کی تائید میں جو تقریر نواب صاحب نے کی اس میں انھوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد اور اس کے ذریعہ سے قیام واستحکام کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

انھوں نے مسٹر گوکھلے کی ملکی خدمات اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی کوششوں کا اعتراف کرکے اور اس اتحاد کے فوائد اور ضرورت کو مسلّمہ اور طے شدہ مسئلہ قرار دیکر اور مغربی تعلیم سے قبل ہندو مسلمانوں کی یگانگی اور اتحاد کے ذکر کے بعد کہا کہ :۔

"لیکن جب سے مغربی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے روز بروز اختلاف بلکہ مخالفت پیدا ہوتی جاتی ہی اور دوستی کی جگہ باہمی نفرت بڑھتی جاتی ہے اتحاد و ارتباط کی خوبی اور ضرورت پر بڑے بڑے لیکچر دیے جاتے ہیں بہت پُرجوش تقریریں کی جاتی ہیں مگر عملاً اختلاف دور کرنے اور اتحاد پیدا کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جاتی میں نہیں سمجھتا کہ یہ مقصد فصیح و بلیغ لیکچروں کے دینے اور اتحاد و ارتباط کی خوبی پر پُرزور تقریریں کرنے سے حاصل ہوگا جب تک کہنے والے

خود ان باتوں کو دور نہ کریں جو باعث اختلاف اور ذریعۂ مخالفت ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ جو غار ہندو اور مسلمانوں کے بیچ میں حائل ہے بعض نیک دل اور ملک دوست اس پر پُل باندھنے اور اس کو ہموار کرنے کی ضرورت سمجھتے اور اس کے لئے نصیحت کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ روز بروز وہ غار زیادہ گہرا زیادہ چوڑا ہوتا جاتا ہے زبان سے کہا جاتا ہے کہ اینٹ لاؤ، چونہ لاؤ، اور اس غار کو برابر کرو مگر ہاتھ میں پھاوڑے اور کُدال ہیں اور بجائے بھرنے کے وہ غار اور وسیع اور عمیق کیا جاتا ہے۔"

پھر کہا کہ :۔

"ان لوگوں کو جو درحقیقت اتحاد کے خواہاں ہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس مہلک بیماری کا علاج زبان سے نہیں ہوسکتا بلکہ ہاتھ سے یہ اختلاف پلیٹ فارم پر فصیح و بلیغ لیکچر دینے سے دور نہیں ہوسکتا بلکہ وجوہِ اختلاف پر غور کرنے، اور اس کے دفع کرنے کی تدبیروں کے عمل میں لانے سے ہوسکتا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے تمثیلاً صوبہ متحدہ میں اردو کے مٹانے کی جو کوششیں مدعیان اتحاد کی طرف سے ہو رہی تھیں ان کو بیان کرکے کہا کہ :۔

"اب فرمائیے کہ اگر اتحاد کے وعظ کہنے والے یہ چاہیں کہ ہم ان کی کوشش کا مقابلہ نہ کریں اور اپنی زبان کے قائم رکھنے کے لئے بھی ان کے حملوں کو دفع نہ کریں اور اگر ایسا کریں تو ہم اتحاد کے دشمن اور مخالفت کے پیدا کرنے والے سمجھے جائیں تو اس میں قصور ہمارا یا ہمارے دوستوں کا ایسا اتحاد تو وہی شخص چاہے گا جو اپنی قومیت کی مخصوص علامت کے ترک کرنے کی پروا نہ کرے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اپنی قوم کو دوسری قوم میں جذب ہوجانے کو اتحاد سمجھے ہم اس کو اتحاد نہیں سمجھتے۔"

پھر دونوں اقوام میں نااتفاقی کی ترقی پذیر حالت کا بیان کرکے اتحاد کی تدبیر یہ بتلائی کہ :۔

"ایسی حالت میں ایک دو نیک دل اور راست باز ہندو مسلمانوں کے روکنے اور سمجھانے

سے کیا ہو سکتا ہی پھر جو لوگ سمجھاتے ہیں وہ دوسری قوم کو نہ اپنی قوم کو حالانکہ سمجھانا چاہیے اپنی قوم کو اور ہر قوم کے لیڈر کو اپنا رسوخ اور اپنا اثر ڈالنا چاہیے اپنے ہی ہم قوم پر تاکہ اس کے دل پر نصیحت کا اثر ہو اور اس کے سمجھانے سے کچھ فائدہ حاصل ہو مسلمان لیڈروں کو چاہیے کہ وہ اپنی قوم کو ان باتوں کے کرنے سے روکنے کی کوشش کریں جن میں ان کا کوئی بڑا مذہبی یا قومی نقصان نہ ہو اور جن کے کرنے سے ان کے ہموطن ہندو بھائیوں کو رنج ہوتا ہو اسی طرح ہندو لیڈروں پر لازم ہی کہ وہ اپنی قوم کو نصیحت کریں کہ جو کام ان کے لیے بہت سخت نقصان پہنچانے والے نہ ہوں اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ ہو اس میں مسلمانوں کی مدد کریں مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کہ مسلمان ہندوؤں کو اور ہندو مسلمانوں کو ہدایت اور نصیحت کریں اور صرف اپنے فائدوں ہی کا خیال رکھیں اس کا نمونہ ہز مجسٹی امیر کابل نے ہمارے سامنے پیش کیا ہی اور ہندوؤں کی دل شکنی کے خیال سے گائے کی قربانی نہ کرنے کی نصیحت کی ہی۔ یہی اصلی اتحاد پیدا کر دینے کی صورت یہی اور دلی محبت قائم کرنے کی شکل ہے۔ کاش ہم لوگ اسے پیش نظر رکھیں اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا خیال کریں اور ایک دوسرے سے کچھ کچھ اپنے فوائد کا نقصان گوارا کریں۔"

آخر تقریر میں انھوں نے اپنا یقین ظاہر کیا کہ :۔

"باہمی اتحاد کی جو کوششیں مسٹر گوکھلے کرتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوں گی اور ہر ایک نیک دل مسلمان ان کی سچی کوششوں میں مدد دے گا اگر ہندو بھائی مسلمانوں کی طرف ایک انچہ بڑھیں گے تو مسلمان دو گز بڑھ کر ان کا خیر مقدم کریں گے۔"

طلبا کو ہندوؤں سے اتحاد کی نصیحت

وہ ہمیشہ طلبائے کالج میں بھی یہی خیالات پیدا کرنا چاہتے تھے اس کے ثبوت میں ہم اس تقریر کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے اپریل ۱۹۰۶ء میں سرسید کی برسی کے موقع پر سرسید کی زندگی سے طلبا کو سبق اور مثال لینے کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں سرسید اور ہندو مسلمانوں کے دوستانہ تعلقات کا تذکرہ کر کے اور نیشنل

کانگرس کی تحریکات سے اختلاف کی علت غائی سمجھا کر کہا کہ :۔

"تم کو چاہیے کہ اتحاد کا سبق بھی ان سے سیکھو اور اپنے ہندو بھائیوں سے سچی دوستی اور خالص دوستانہ برتاؤ رکھو ملک کے لئے عموماً اور قوم کے لئے خصوصاً ایسا اختلاف نہایت مضر ہے اس کو نفرت کی نظر سے دیکھو اور جو کوئی اختلاف کو اچھا سمجھتا اور اس پر عمل کرتا ہو اس کو ملک کا اور خود اپنی قوم کا دشمن سمجھو مجھے وہ اختلاف جو ان چالیس پچاس سال کے عرصہ میں ہندو اور مسلمانوں کے باہم پیدا ہو گیا ہے دیکھکر نہایت رنج اور صدمہ ہوتا ہے۔ غدر سے پہلے جبکہ انگریزی تعلیم کا نام و نشان نہ تھا دونوں قوموں میں برادرانہ اتفاق تھا ایک دوسرے کو دوست سمجھتے تھے شادی اور غمی کی تقریبوں میں دونوں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے یہاں تک کہ میں نے اپنے وطن میں دیکھا تھا کہ کوئی تقریب خوشی کی اور غمی کی ہندوؤں میں نہ ہوتی تھی کہ ہم مسلمان نہ بلائے جاتے ہوں اور کوئی جلسہ یہاں تک کہ عید اور بقر عید اور محرم کا ہم مسلمانوں میں نہ ہوتا کہ جس میں ہندو شریک نہ ہوتے ہوں دونوں قومیں شیر و شکر تھیں اور ایک برادری معلوم ہوتی تھیں مگر میں دیکھتا ہوں کہ جب سے انگریزی تعلیم نے ترقی کی ہے اور ہندو اور مسلمان کچھ کچھ تعلیم پانے لگے ہیں تب سے وہ دوستی گھٹتی اور دشمنی بڑھتی جاتی ہے کیا تعلیم نے جس سے اتحاد پیدا ہونے اور نفاق و اختلاف دور ہونے کی امید ہوسکتی ہے یہ جھگڑا پیدا کیا ہے اور کیا علم سیکھ کر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے متنفر ہونے لگے ہیں؟ اگر ایسا ہی تو افسوس ہے ایسی تعلیم پر اور حیف ہے اس تہذیب پر اس سے تو جہل ہزار درجہ بہتر ہے مگر یہ ایک ایسا حقیقی واقعہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا روز بروز تعصب بڑھتا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو برا سمجھتا اور علانیہ برا کہتا ہے بعض گروہ تعلیم یافتوں کا اور بعض اخبار اور رسالے ہندو اور مسلمانوں کے نفاق کی آگ مشتعل کرنے کے لئے ہی گویا پیدا ہوئے ہیں اور بجائے پانی کے اس آگ پر تیل ڈال رہے ہیں اگرچہ زبانی دعوے اتحاد کا کیا جاتا ہے اور اس کی خوبیوں پر بڑے بڑے لیکچر دیے جاتے ہیں مگر اس پر عمل کرنے والے روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں۔ اس نا اتفاقی کو دونوں قوموں کے سمجھدار اور نیک دل

آدمی رنج سے دیکھتے ہیں اور نہایت افسوس کرتے ہیں تعلیم کا تو یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے اور چونکہ نتیجہ آنکھوں کے سامنے ہے اس لئے سوائے اس کے کیا سمجھا جائے کہ یہ ناقص تعلیم کا نتیجہ ہے۔ کامل تعلیم نے جن کے دلوں پر اثر کیا ہے وہ اس گناہ سے پاک ہیں۔ مرحوم راناڈے جج ہائیکورٹ بمبئی انھیں نیک دل آدمیوں میں سے تھے جو سچے دل سے اتحاد کی قدر کرتے اور اس کا سبق دیا کرتے تھے۔ ان کا وہ لیکچر جو چند سال ہوئے لکھنؤ میں دیا تھا ہر مسلمان اور ہندو کو صفحۂ دل پر لکھنا چاہئے جس میں انہوں نے نہایت سچائی اور صفائی سے مسلمانوں کے بعض اوصاف کی تعریف کی تھی اور جو فائدے ان سے ہندوؤں کو پہنچے اس کا علانیہ اعتراف کیا تھا مگر برخلاف اس کے بہت سے مدعیانِ تعلیم ایسے ہیں کہ مسلمانوں کے بزرگوں، ان کے بادشاہوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو ایسے بُرے لفظوں سے یاد کرتے ہیں کہ سننے والے کا خون جوش میں آجاتا ہے، مسلمان بھی کچھ کمی نہیں کرتے وہ بھی اَلسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ پر عمل کرتے اور گالیاں سُناتے ہیں یہ ایک نہایت بدنصیبی کی نشانی ہے اور دونوں قوموں کے لئے یہ باتیں شرم کے لائق ہیں۔

میرے عزیزو! تم ہرگز سرسید کے پیرو نہ سمجھے جاؤ گے نہ تم تعلیم یافتہ کہلائے جانے کے مستحق ہوگے اگر تم نے اس زہریلے مادّہ کو اپنے جسموں میں سرایت کرنے دیا اور تم نے بھی ہندو مسلمانوں میں کچھ فرق سمجھا اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نقصان نہ صرف تم کو ہوگا بلکہ تمہاری ساری قوم کو اور نہ صرف تم بدنام ہوگے بلکہ یہ کالج بھی بدنام ہوگا اور ہم پر اس کا الزام آئیگا۔ مجھے نہایت روحانی تکلیف ہوتی ہے جب میں بعض اخباروں میں دیکھتا ہوں کہ علی گڑھ پارٹی متعصب ہے اور اس کے تعلیم یافتہ نوجوان ہندوؤں کے مخالف ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے اگر اس کا خیال یا عمل اس پر ہو تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ سبق تم کو کس نے سکھایا کیا مرحوم سرسید نے اور کیا ہم نے، حاشا وکلّا نہ سرسید نہ ہم اس کے ملزم ہیں بلکہ برخلاف اس کے ہم نہایت نفرت وحقارت سے ایسی باتوں کو دیکھتے ہیں اس لئے اے میرے عزیز بچو! کبھی

ایسے خیال کو تم دل میں نہ آنے دو اور کبھی ایسی بات کو جس سے جھگڑا پیدا ہو نہ سنو ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھو ان کے بزرگوں کو ادب اور عزت سے یاد کرو ان کے ساتھ محبت اور اخلاق سے پیش آؤ اور ان کے ساتھ سچا دوستانہ برتاؤ رکھو اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی بات اختلاف کی انھیں کی طرف سے پیدا ہو تو تم اس کے جواب میں ایسا برتاؤ کرو جس سے خود وہ شرمندہ ہوں وہ تمہارا تحمل اور تمہاری دوستی دیکھکر تمہاری قدر کریں وہ تمہارے بزرگوں کو نیکی سے یاد کرنے لگیں اور بجائے بدی کے نیکی کا برتاؤ دیکھ کر وہ خود اپنے طرز عمل کو بدلنے پر مجبور ہوں لیکن یہ انصاف کی بات نہیں کہ تم اپنے آپ کو معصوم اور پاک سمجھو اور اختلاف کے سارے گناہ کا الزام ہندوؤں کو دو تم اس کالج کے نیک نام طالب علم اور سر سید کے سچے مقلد اور ہمارے پیارے عزیز اسی وقت سمجھے جاؤ گے جبکہ تم اپنے ہموطن بھائیوں کی ناگوار باتوں سے چشم پوشی کرو اور ان کی اچھی باتوں کو دل سے سنو ان ناقص تعلیم یافتوں کو نہ دیکھو جو اختلاف پیدا کرنے کے خواہاں ہیں بلکہ ان عالی دماغ ہندوؤں کی باتیں سنو جو اتحاد و اتفاق بڑہانے کے لئے کوششیں کرتے ہیں اور میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ جس قدر میرے دوست میری قوم کے ہیں اس سے کچھ کم ہندوؤں اور پارسیوں میں نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہوگا کہ بعض ان میں سے ایسے ہیں جن کی عزت اور قدر میرے دل میں اپنے بھائیوں سے بڑھ کر ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ وہ بھی مجھے اپنا دوست سمجھتے اور میرے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے ہیں اپنی حالت دیکھو اور جو فائدے اس سے حاصل ہوتے ہیں اور جو روحانی خوشی اس سے ہوتی ہے اس پر خیال کرو میری تو اس سے بڑھ کر کوئی آرزو نہیں ہے کہ سب ہندو اور مسلمان ایسے ہی ہوں اور سب ایک دوسرے کو عزت اور محبت کی نظر سے دیکھیں اور اپنی اپنی قوم پر رحم کریں ہم ہندو اور مسلمانوں پر دوسری مصیبتیں اور آفتیں افلاس، ادبار، جہالت تنگی رزق کی کیا کم ہیں جو باہمی تفرقہ کی بڑی مصیبت کو ہم لوگ اپنے اوپر لیتے اور اس بلائے ناگہانی کے لئے اپنے دروازے کھولتے ہیں سلے خدا

تو ہندو اور مسلمانوں پر رحم کر اور ہم دونوں قوم کے تعلیم یافتوں کو توفیق دے کہ وہ اس عناد کی آگ کو بجھا دیں نہ کہ اس کو تیز کریں۔"

سودیشی تحریک کی حمایت

نواب صاحب اگرچہ کانگرس کے اصولِ کار اور تخریبی ایجی ٹیشن کے سخت مخالف تھے تاہم وہ سدیشی تحریک کی طرف مائل تھے اور ملک میں صنعت وحرفت کے مٹ جانے اور غیر ملکی چیزوں کی گرم بازاری میں جو اقتصادی نقصان ملک کو پہنچ رہا تھا اس سے وہ بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ تقسیم بنگال کے بعد جو سدیشی تحریک ہندوستان میں پیدا ہو گئی تھی اس کے متعلق اکتوبر ۱۹۰۵ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں وہ مصنوعاتِ یورپ کی ترقیوں اور دیسی کارخانوں کے بند ہونے اور یہاں کے کاریگروں کی ناقدری پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"اس زمانہ میں ایشیائی بلاد کے معمور بازار اور بھری دکانیں سب اصل ویرانے ہیں ان سے ملک کو فائدہ کیا نقصان پہنچتے ہیں دلّی، قاہرہ، دمشق، قسطنطنیہ، طہران وغیرہ سب بظاہر اسباب سے معمور اور آباد دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ وہاں کی دولت اور رفاہیت کا راگ گاتے ہیں ذرا سوچو کہ یہ بزازوں کی دکانیں یہ خوبصورت چینی کے برتنوں کے ڈھیر یہ بساط خانے وغیرہ سب کے سب مٹی کے ڈھیر ہیں جو ہمارے چاندی، سونے کے عوض یورپین کارخانو سے چلے آتے ہیں۔ ایشیائی لوگ محنت و مشقت سے پیسہ پیسہ کر کے جوڑتے ہیں اور اپنی کمائی کے وارث یورپین دکانداروں کو بنا دیتے ہیں یہ ایشیائی دکاندار جو یورپین اشیا بیچتے ہیں بظاہر ہمیں سوداگر معلوم ہوتے ہیں مگر درحقیقت یورپ کے خیر خواہ اور نمک حلال کارندے ہیں اپنے وطن اور ہم وطنوں کا خونِ جگر پیتے ہیں اپنے ملک کی ترقی کو روکتے ہیں اپنے بھائی بندوں کے ہاتھ پیر باندھ کر بیگانوں کے سپرد کرتے ان کی دل آزاری کو بڑھنے نہیں دیتے ان کی دماغی روشنی کو بجھا دیتے ہیں۔ اگر تم کسی پُر رونق بازار سے گزرو، ذرا غور کرو کہ اس ظاہری رونق کا تم پر کیا اثر پڑتا ہے۔ خبردار دھوکا نہ کھانا یہ رونق اور یہ افراط کساد بازاری

وقتھا سے زیادہ مضر ہے یہ تمہاری دانشمندی کا نتیجہ نہیں ہے یورپ کے کارخانہ دار اس تعریف کے مستحق ہیں تم محنت کرو اور جو کما کر لاؤ وہ فوراً یورپ کو بھیجدو، تمہارے ہموطن دکانوں پر دامِ تزویر بچھائے تمہیں لوٹنے کو بیٹھے ہیں جیسے مکڑی اپنے جالے میں غریب مکھی کو پھانس لیتی ہے ایسی ہی یہ بیکاری اور صنعت و حرفت سے ناآشنائی ہمیں دام و آلام فلاکت میں پھنسائے رہتی ہے پس جو لوگ اپنے ملک کے اپنے گھر کے اور اپنی ذات کے بہی خواہ ہیں انھیں آنکھیں کھولے مستعد رہنا چاہیئے اور قبل از وقت پیش آنے والی مصیبت سے بچنے کے لئے کوششیں کرنی چاہئیں۔"

آخر میں مسلمانوں میں علمی ترقی کا فقدان صنعت و حرفت سے غفلت اور ان کے مخصوص پیشوں اور صنعتوں پر دوسروں کے قبضہ کر لینے کا تذکرہ کر کے زوردار لفظوں میں مسلمانوں کو اس تحریک میں شریک ہونے اور صنعت و حرفت میں ترقی کی کوشش کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"آج کل سدیشی تحریک اس زور شور سے پھیل رہی ہے اور مسلمان بدستور غافل ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ جو چند پیشے ان کے ہاتھ میں ہیں وہ بھی ان سے چھن جائیں گے۔ جیسے اب ہم نوکریوں اور علمی کاموں میں پھسڈی ہیں ویسے ہی تجارت اور صنعت و حرفت کے پیشوں میں ناکام رہیں گے شاید آٹھ دس برس بعد ہی یہ نوبت آجائے گی کہ بازاروں میں سینکڑوں دکانیں لکھے پڑھے لوگوں کی نظر آئیں گی اس وقت ہماری سخت مشکل ہوگی اور ہمیں اندر گھسنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔ ہم اس کو بڑی خوش نصیبی اور دانشمندی تصور کریں گے اگر اس تحریک سے ہم فائدہ اٹھائیں اپنے دل و دماغ سے کام لیں اپنے مال و دولت کو اس پر صرف کریں۔ اور آیندہ اس کے نفع سے متمتع ہوں اس سے مخالفت کا وہی نتیجہ ہوگا کہ جو مغربی تعلیم سے متنفر ہو کر ہم نے حاصل کی سدیشی تحریک ہندوستان ہی میں محدود نہیں ہے۔ جن قوموں میں قومیت کا خیال پیدا ہوتا جاتا ہے وہ اپنے زوال کی حالت دیکھ کر متاسف